تاریخ کی گواہی

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز
ٹبک سٹریٹ68-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

نام کتاب : تاریخ کی گواہی
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**
بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : نین تارا
اشاعت : 2014ء
قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

سردار عظیم اللہ خاں میو
کے نام

فہرست

پیش لفظ

یہ مضامین روزنامہ جہان پاکستان میں ہفتہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ میں ایڈیٹوریل ٹیم کے ارکان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان مضامین کو شائع کرنے میں تعاون کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی

15- ستمبر 2014ء

لاہور

تاریخ کے گمنام لوگ

روایتی تاریخ میں ان لوگوں کو تاریخ کے بنانے والوں اور تشکیل دینے والوں کو سمجھا جاتا ہے کہ جن کے پاس سیاسی طاقت اور اقتدار ہو۔ اس لئے اس تاریخ نویسی میں حکمراں طبقے کے کردار کو اُبھارا جاتا ہے اور وہ طبقات کہ جو سیاسی طاقت اور اقتدار سے محروم ہوتے ہیں انہیں تاریخ میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی ہے۔

روایتی تاریخ میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ افراد تاریخ کو بناتے ہیں اس نظریئے کی وضاحت ٹامس کارلائی نے اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' (Heroes and Hero Worship) میں کی ہے۔ ان افراد میں سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افراد تنِ تنہا اپنی ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی توانائی کے ساتھ تاریخ کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ اسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے برٹولڈ بریخت نے اپنی نظم میں ان سوالات کو ابھارا ہے کہ کیا جب سیزر نے گال کو فتح کیا تو وہ اکیلا ہی تھا؟ کیا اس کا کوئی باورچی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا؟ جب انگلستان پر اسپین نے بحری حملہ کیا اور اس کے جہاز تباہ ہوئے تو بقول بریخت اسپین کا بادشاہ فلپ بحری بیڑے کی تباہی پر رویا۔ اس پر وہ سوال کرتا ہے۔ کیا اور کوئی رونے والا نہیں تھا؟

بریخت نے اس چھوٹی سی نظم میں روایتی تاریخ کو چیلنج کرتے ہوئے اس کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس نے اس اہمیت کو ظاہر کیا ہے کہ روایتی تاریخ دان تاریخی عمل کو محدود دائرے میں رکھتے ہوئے اس کو سطحی طور پر دیکھتے ہیں جبکہ اس عمل میں عام لوگوں کے کردار کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

جرمن فلسفی ہیگل نے فرد کے تاریخی کردار کے بارے میں کہا ہے کہ وہ بے خبری کے عالم میں فطرت کے منصوبوں کو پورا کرتا ہے۔ جب فطرت کے یہ منصوبے مکمل ہو جاتے ہیں تو وہ اسے بیکار سمجھ کر ناکارہ بنا دیتی ہے۔ جیسے سکندر نے جب فتوحات مکمل کر لیں تو کم عمری ہی میں اس کا انتقال

ہو گیا کیونکہ اب اور زیادہ فتوحات کی ضرورت نہیں تھی۔ سیزر نے جب گال اور مصر وغیرہ کی فتوحات کر کے خود کو طاقت ور بنایا تو اب رومن سلطنت کو اس کی مزید ضرورت نہیں تھی اسی لئے وہ قتل ہوا۔ اسی طرح جب نپولین اپنا مشن پورا کر چکا تو اسے بے بس بنا کر سینٹ ہیلینا میں زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا۔

ہیگل کے مطابق یہ افراد اپنے منصوبوں کی تکمیل میں اخلاقی روایات کے پابند نہیں ہوتے ہیں وہ ان سے بالاتر ہو کر اپنے مقصد کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ ہیگل کے اس نظریے میں ان افراد کے ساتھ عوام کا کوئی ذکر نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کا عمل اوپر ہی اوپر ہو رہا تھا جبکہ نیچے عام لوگ اس عمل میں بے معنی تھے۔

ٹالسٹائی نے اپنی کتاب ''جنگ اور امن'' میں ان افراد کے بارے میں کہا ہے کہ ان کی حیثیت اس طرح کی ہے کہ جیسے جانوروں کے گلہ کے آگے کسی ایک جانور کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جاتی ہے جس کی آواز کے پیچھے باقی جانور خاموشی سے اس کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔

روسی مفکر پلیخانوف نے اپنی کتاب ''تاریخ میں فرد کا کردار'' کے بارے میں لکھا ہے کہ سیاسی سماجی اور معاشی قوتیں جب تاریخ کے عمل کو آگے بڑھاتی ہیں تو اس کی پختگی کے مرحلے پر افراد آ کر منصوبوں کو پورا کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں تاریخی عمل کے بارے میں جو تحقیقات ہو رہی ہیں ان میں اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان جماعتوں، طبقات اور گروپوں کے تاریخی کردار کو واضح کیا جائے کہ جنہیں تاریخ نے اب تک فراموش کر رکھا ہے۔ ان میں اب تک خاص طور سے غلاموں اور کسانوں کے کردار پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً یونان اور روم میں غلاموں نے ان کی تاریخ میں کیا کردار ادا کیا ہے اور اس کی وجہ سے یونان کے حکمراں طبقوں اور فلسفیوں کو روزمرہ کے کاموں سے جب نجات ملی تو انہوں نے سیاست، فلسفہ، ادب، شاعری، مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی اور عمارتوں کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اسی وجہ سے کسی بھی یونانی مفکر نے غلاموں کی بے بسی، محنت و مشقت اور ان کی خدمات کے بارے میں کسی قسم کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ارسطو غلامی کے ادارے کو معاشرے کے لئے لازمی سمجھتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ایتھنز کے شہریوں کو جو آرام اور آسائش میسر تھا اس کے لئے وہ اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہی صورت حال رومیوں کے زمانے میں تھی

کہ جب ہزاروں کی تعداد میں فتوحات کے بعد لوگوں کو جنگی قیدی بنا کر لایا جاتا تھا اور پھر بطورِ غلام منڈیوں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ یہ غلام گھریلو کام کاج سے لے کر معدنیات کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ ایسا کام کہ جس کی وجہ سے ان کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں تھی۔ غلامی کا یہ ادارہ عرب دورِ حکومت میں بھی رہا اور عباسی سلطنت کے خاتمے کے بعد اُبھرتے ہوئے مسلم شاہی خاندانوں میں بھی باقی رہا۔ ہندوستان میں خاندانِ غلاماں کی حکومت اور مصر میں مملوک حکومت اس کی مثال ہے کہ جب غلاموں نے سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا۔

پندرھویں صدی میں جب امریکہ دریافت ہوا اور اہل ہسپانیہ نے جنوبی امریکہ میں اپنا اقتدار قائم کیا تو انہیں معدنیات کی کانوں اور بڑے بڑے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے لوگوں کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے افریقہ سے غلاموں کو یہاں لایا گیا۔ غلاموں کی اس وقت اور زیادہ ضرورت پڑی جب شمالی امریکہ میں اہل یورپ نے اپنی کالونیاں بنائیں۔ جب جزائر غرب الہند میں گنے کی کاشت کی جانے لگی اور ان سے شکر بنانے کا عمل شروع ہوا تو اس کام کے لئے بھی افریقہ سے غلاموں کو لایا گیا، ایک اندازے کے مطابق چار سے چھ سو ملین افریقیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر اور غلام بنا کر یہاں پر ان سے معدنیات کی کانوں اور کھیتوں میں کام کروایا گیا۔

شمالی امریکہ کی آزادی کے وقت جو اعلامیہ شائع ہوا اس میں ان افریقی غلاموں کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی امریکہ کے دستور میں ان کے بارے میں کچھ کہا گیا۔ غلامی کا سوال اس وقت اُٹھا جب امریکہ میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان سول وار ہوئی اور جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ سے غلامی کا خاتمہ ہوا۔ لیکن غلامی کے اس خاتمے کے باوجود امریکہ کے کالے باشندے ایک عرصہ تک اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہے۔ اگرچہ 1960ء کی تحریک میں نسل پرستانہ قوانین کا خاتمہ تو ہوا مگر اب بھی ان کے بارے میں متعصّبانہ رویئے باقی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں مورّخین بلیک ہسٹری کے عنوان سے تاریخ میں غلاموں کے کردار اور ان کے عمل کا جائزہ لے رہے ہیں کہ جسے اب تک نظر انداز کیا گیا تھا۔ مثلاً ٹری نی ڈاڈ (Trinidad) کے گورنر ایرک ولیم (Eric William) نے اپنی کتاب ''غلامی اور سرمایہ داری'' (Slavery and Capitalism) میں اس نظریئے کو پیش کیا ہے کہ جزائر غرب الہند میں غلاموں نے شکر کی پیداوار کے ذریعہ سرمائے کو پیدا کیا جو صنعتی انقلاب کا باعث ہوا اور پھر سرمایہ دارانہ نظام نے غلامی کے

ادارے کوختم کر کے مزدوروں کے طبقے کو پیدا کیا۔یعنی غلاموں نے سرمایہ پیدا کیااور سرمائے نے غلامی کا خاتمہ کیا۔کیونکہ اب فیکٹریوں میں اُجرت پرکام کرنے والے مزدور زیادہ سستے اور منافع بخش تھے۔

تاریخ کا ایک اور اہم گمنام طبقہ کسانوں کا تھا کہ زرعی معاشرے میں کسان پیداوار کا کام کرتے تھے جس کی بنیاد پرشہروں میں حکمراں طبقے اور پیشہ ور برادریاں اور آبادی کے دوسرے لوگ پرورش پاتے تھے۔لیکن جاگیردارانہ معاشرے میں کسانوں سے ان کی محنت سے کی ہوئی پیداوار کو چھین لیا جاتا تھا اور ان کے پاس اس قدر رہنے دیا جاتا تھا کہ وہ بہ مشکل گزر اوقات کرسکیں۔اس استحصال کی وجہ سے کسان برابر بغاوتیں کرتے رہے تھے۔چین میں کسانوں کی یہ بغاوتیں اب تاریخ کا ایک حصہ ہوگئی ہیں۔ہندوستان میں کسانوں کی بغاوتوں پرعرفان حبیب اپنی کتاب ''ہندوستان کی تاریخ پرمضامین'' Essays on the History of India's'' میں تفصیلی مقالہ لکھا ہے۔جس میں ہونے والی بغاوتوں کی نشاندہی کی ہے۔اگرچہ یورپ میں مختلف تاریخی ادوار میں کسانوں کی بغاوتیں ہوئیں جن میں سے ایک 1381ء کی انگلستان میں ہونے والی بغاوت ہے جس کا رہنما واٹ ٹیلر (Vat Taylor) تھا۔یہ بغاوت ٹیکسوں کی زیادتی کے خلاف تھی۔اس بغاوت کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اس کے رہنما کو قتل کر دیا گیا اور باقی کسانوں کا قتلِ عام کرکے اسے کچل دیا گیا۔

کسانوں کی دوسری اہم بغاوت سولہویں صدی میں جرمنی میں ہوئی۔جب مارٹن لوتھر نے چرچ کی بدعنوانیوں کے خلاف بغاوت کی تو اس سے حوصلہ پا کر کسانوں نے بھی بغاوت کا اعلان کیا کہ اس نظام کا خاتمہ کیا جائے جو جاگیرداروں نے ان پرمسلط کر کے انہیں غلام بنا رکھا ہے۔مگر یہ بغاوت اس لئے ناکام ہوئی کہ جرمن ریاستوں کے تمام حکمراں ان کے خلاف متحد ہو گئے اور لوتھر نے بھی ان کو بدمعاش اور لٹیرے کہہ کر حکمرانوں سے مطالبہ کیا کہ ان کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں۔اس کے نتیجے میں کسانوں کا قتلِ عام ہوا اور بغاوت کو کچل دیا گیا۔

اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب کے بعد صنعتی مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا۔اگرچہ تاریخ کے ہر دور میں محنت ومشقت کرنے والے مزدور رہے ہیں جنہوں نے عمارتوں اور سڑکوں کی تعمیر، وزنی سامان اُٹھانا اور بازاروں اور منڈیوں میں دوکانوں پرسامان کو پہنچانا اور لیجانا اور اس

قسم کے اور دوسرے محنت کے کام۔ لیکن صنعتی انقلاب میں مزدوروں کو فیکٹریوں کی ایک چھت تلے جمع کرنا۔ صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں یہ اس طرح سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کرتے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ہفتے میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی رہائش ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ گندے پانی کی نکاسی اور کوڑا کرکٹ اُٹھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تعلیم اور صحت کی ریاست ذمہ دار نہیں تھی۔ غذا کی کمی اور صحت مند ماحول کے نہ ہونے سے ان کی زندگی میں محرومیاں ہی محرومیاں تھیں۔ لیکن انہوں نے صنعتی انقلاب کی ترقی اور سرمایہ داری کے عروج میں جو حصہ لیا اس کا ذکر کم ہی کیا جاتا ہے۔ اس کے بجائے روایتی مورّخین نئی مشینوں کی ایجادات اور ٹیکنالوجی کو کامیابی کا اصل کردار بتاتے ہیں۔

اینگلز اور کارل مارکس نے انگلستان کے مزدوروں کی غربت، مفلسی، مفلوک الحالی، بے بسی اور استحصال کی اپنی تحریروں میں تصویر کشی کی ہے۔

غلاموں اور کسانوں کے علاوہ ایسے لوگوں جماعتوں اور گروہوں کی بڑی تعداد ہے کہ جنہیں تاریخ میں جگہ نہیں دی گئی ہے اور نہ ہی ان کے کاموں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ جنہیں تاریخ سے باہر رکھا گیا ہے، کیونکہ روایتی تاریخ مردوں کی تاریخ ہے، اس میں اگر عورتوں کا ذکر ہے بھی تو وہ حاشیہ پر ہے۔

1970ء کی دہائی میں تحریکِ نسواں کے اُبھرنے کے بعد اب عورتوں کو تاریخ کی تشکیل میں شامل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی تاریخ پوری طرح سے سماج کے تمام طبقوں پیشہ وروں اور مختلف برادریوں کے کام تاریخ میں شامل نہیں کرتی ہے۔ مثلاً گداگر، کاریگر، گھریلو ملازمین، دکاندار، ہوٹلوں میں کام کرنے والے، ڈرائیور، چرواہے، زائرین، مراثی، قوال، عوامی موسیقار، دھوبی، درزی، نائی، مزدور، معذور لوگ اور خانہ بدوش وغیرہ۔

تاریخ میں ان محروم لوگوں کا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ کیونکہ ان کی اکثریت ناخواندہ تھی۔ لہٰذا اگر تاریخ میں کہیں ان کا ذکر ہے تو دوسروں نے ان کو اپنی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم ان لوگوں کے احساس اور جذبات سے ناواقف ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لئے مورّخ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تخیل کی بنیاد پر ان کی زندگی ان کے معمولات اور ان کے خیالات کا اندازہ لگائے۔

ہمیں ان گمنام لوگوں کے بارے میں روایتی تاریخ کے ماخذوں سے بہت کم معلومات ملتی ہیں۔اس وجہ سے ضروری ہو جاتا ہے کہ متبادل ماخذوں اور ذریعوں کو دریافت کر کے انہیں کھنگالا جائے۔مثلاً آثارِقدیمہ کی مدد سے عام لوگوں کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ ملتا ہے،مثلاً وہ کس قسم کے اوزار اور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ان کی رہائش گاہیں کس قسم کی تھیں۔ان کے ڈھانچوں کی مدد سے ان کی غذا،ان کی عمر اور ان کی بیماریوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔دوسرا اہم ماخذ تصاویر ہیں۔یہ تصاویر پتھر کے زمانے کے غاروں سے لے کر کانسی اور لوہے کے زمانے تک غاروں،مندروں اور مقبروں میں ملتی ہیں۔مثلاً اہرامِ مصر کی دیواروں پر جو تصاویر ہیں ان میں عام آدمی کی روزمرہ کی زندگی کے معمولات اور مشاغل کو پینٹ کیا گیا ہے۔ان تصاویر کے ذریعہ مصر کے لوگوں کے مذہبی عقائد کا بھی پتہ چلتا ہے۔اسی طرح سے جزیرۂ کریٹ کے محلات میں Minion تہذیب کے دور کی دیواری تصاویر جن سے اس عہد کی سماجی زندگی جھلکتی ہے۔یہ تصاویر ہمیں دوسری تہذیبوں میں دیواروں اور ستونوں پر ملتی ہیں۔

تیسرا اہم ماخذ ادب ہے مثلاً سمیری تہذیب میں گِل گامیش کی داستان،یونانی تہذیب میں ہومر کی ILLIAD اس کے ڈرامہ نویسوں کے ڈرامے،ہندوستان میں مہابھارت اور رامائن کی داستانیں ان میں تاریخ کے گنام لوگ چھپے ہوئے ہیں جنہیں تلاش کر کے سامنے لانا مورخ کا کام ہے۔میسوپوٹامیہ،مصر اور دوسری قدیم تہذیبوں میں جو تحریریں ملی ہیں ان میں خاندان اور دوستوں کے درمیان خط و کتابت ہے۔تاجروں کا حساب کتاب ہے اور حکمرانوں کے احکامات اور قوانین ہیں جن کی مدد سے عام لوگوں کی سماجی زندگی کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔

تاریخ کے ان فراموش شدہ لوگوں کی زندگی اور ان کے روزمرہ کے معمولات کا جائزہ لیتے ہوئے مورّخ کو اس عہد کے حالات،ماحول میں جذب ہو کر ان کی زندگی کو دیکھنا ہوگا۔زمانہ امن میں کسان کھیتوں میں کام کرتے تھے کاریگر اپنی پیشہ ورانہ صنعتوں میں مصروف تھے،دکاندار لوگوں کی ضروریات کی اشیاء بازار میں فروخت کر رہے تھے۔عورتیں روزمرہ کے معمولات کے مطابق گھریلو کام کاج میں مصروف تھیں جبکہ بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔کہیں کہیں سے کسی کے گانے اور موسیقی کی آواز آ رہی تھی کہ اچانک یہ سین بدلتا ہے کسی حملہ آور نے اچانک حملہ کر کے اس پُرامن اور پُرسکون ماحول کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔کھیتوں اور مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔سامان کو

لوٹ لیا گیا مردوں کو قتل کر کے عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔ امن اور خوشگوار ماحول کی جگہ تباہی اور بربادی نے لے لی۔

تاریخ میں عام لوگ ان مرحلوں سے بار بار گزرتے رہے تھے ان کے اپنے حکمراں اور ریاست کے عہدیداران سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کرتے، رشوت لیتے اور بدعنوانیوں میں ملوث ہوتے۔ غریب لوگ انصاف کی تلاش میں دربدر مارے پھرتے تھے۔ اگر مذہبی رہنماؤں کا غلبہ ہو جاتا تھا تو مذہب کے نام پر لوگوں کو زندہ جلایا جاتا تھا، قتل کیا جاتا تھا اور اذیت دی جاتی تھی۔ تاریخ کے ان گمنام لوگوں میں جرأت، ہمت، مزاحمت اور زندہ رہنے کا حوصلہ پنہاں تھا کہ جس نے انہیں ان تمام سختیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیا۔ ان لوگوں نے خاموشی سے اپنے عمل اور معمولات سے تاریخ کی تشکیل کی۔

اس مضمون میں ان گمنام لوگوں اور جماعتوں کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں عام لوگوں کے بارے میں عدلیہ کی دستاویزات اہم ہیں کہ جن سے لوگوں کے سماجی مسائل، جائیدادوں کے جھگڑے اور وراثت کے قوانین کا پتہ چلتا ہے۔ ان دستاویزات سے معاشرے میں ہونے والے جرائم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ عدالتوں کے فیصلوں کی روشنی میں قانون کی بالادستی یا اس کی ناہمواری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح پولیس کے ریکارڈ سے بدامنی، کرپشن اور ہونے والے مختلف جرائم کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ریونیو کے ریکارڈ سے کسانوں اور پیشہ وروں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں کے ذریعہ سماج کے طبقات میں امیری اور غریبی اور سماجی ناہمواری کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

خفیہ اداروں کے ریکارڈ سے ملک میں ہونے والی تبدیلیوں، حکومت کے بارے میں لوگوں کی رائے اور سازشوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان دستاویزات سے لوگوں کے مذہبی عقائد، سماجی رویے، تجارتی سرگرمیاں اور آپس کے لین دین اور معاہدوں کے ذریعہ نچلی سطح پر پہنچنے والی تاریخ کا مواد ملتا ہے۔

گداگر

تاریخ کے ہر دور میں گداگروں کا طبقہ موجود رہا ہے۔ گداگروں کی کئی قسمیں ہوتی تھیں۔ ایک وہ جو غربت، مفلسی اور بے روزگاری کے سبب اس پیشے کو اختیار کرتے تھے۔ دوسرے وہ کہ

جنہیں خاندان والے بے سہارا چھوڑ دیتے تھے اوران کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا تو وہ مجبوراًاس پیشے کو اختیار کرتے تھے۔تیسرے پیشہ ور گداگر ہوتے تھے جو بچوں کو اغواء کر کے ان کو جسمانی طور پر معذور بنا کر ان سے زبردستی بھیک منگواتے تھے۔اس قسم کے گداگروں کے بارے میں رومی فلسفی 'سینی کا' نے لکھا ہے کہ یہ لوگ بچوں کو اغواء کرتے ہیں۔ان کی ٹانگیں، بازو توڑتے ہیں اوران کو جسمانی طور پر اس قدر بھدا کر دیتے ہیں کہ لوگ ان پر ترس کھا کر خیرات کریں۔چارلس ڈکنس نے بھی اپنے ناولوں میں وکٹورین دور کے گداگروں کے بارے میں لکھا ہے کہ جو منظّم طریقہ سے یہ کام کرتے تھے۔پیشہ ور گداگروں کا یہ عمل آج بھی موجودہ دور میں جاری ہے۔گداگری کی چوتھی شکل وہ ہے کہ جس میں کچھ مذاہب کے فرقے اس کو اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ وہ دنیاوی آسائشوں اور مال ودولت کو ترک کر دیتے ہیں جیسے بُدھ مت میں یہ بھکشو کہلاتے ہیں۔جو گھر گھر جا کر کھانا بطورِ بھیک مانگتے ہیں باقی وقت عبادت میں گزارتے ہیں۔کلبّی فرقے کے لوگ ترکِ دنیا کے بعد اپنا گزارا بھیک پر کرتے تھے۔عیسائیوں کے فرقے فرانسس سکن کے پیروکار بھی خیرات پر گزارا کرتے تھے۔گداگری سے منسوب ہالینڈ کی تاریخ کا یہ واقعہ ہے کہ جب سولہویں صدی میں وہ اسپین سے علیحدہ ہونے کی تحریک چلا رہے تھے تو ان کا ایک وفد جب اپنے مطالبات کے ساتھ گورنر کے سامنے پیش ہوا تو گورنر کے ایک مصاحب نے ان مطالبات کے ردِعمل کے طور پر گورنر سے کہا کہ یہ لوگ گداگر ہیں ان کی باتوں کو تسلیم نہیں کیا جائے۔اس کے بعد وفد کے اراکین نے خود کو گداگر کہلا کر عوام میں آزادی کے جذبات کو اُبھارا۔جب ان کی بحریہ نے اسپین کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے بھی خود کو سمندری گداگر کہا،اس طرح ان گداگروں نے جنگِ آزادی کے ذریعہ اسپین کے تسلط کا خاتمہ کیا۔گداگروں کے بارے میں سماج کے دومختلف رویئے تھے۔ایک رویہ یہ تھا کہ ان کو خیرات دے کر ثواب حاصل کیا جائے۔دوسرا یہ کہ ان کو خیرات کے ذریعہ معاشی سہارا دیا جائے تا کہ یہ جرائم میں ملوث نہ ہوں۔

انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد گداگروں کے بارے میں منفی رویئے پیدا ہوئے۔حکومت کی جانب سے ورک ہاؤسز کا قیام عمل میں آیا۔تا کہ جو بیکار ہیں انہیں یہاں پر رکھا جائے اوران سے کام لیا جائے۔

موجودہ دور میں صنعتی اور ترقی یافتہ ملکوں میں گداگری کا یا تو خاتمہ ہو گیا ہے یا یہ بہت کم ہے جس کی وجہ سے معاشرہ ان کی موجودگی سے بے خبر ہے۔ لیکن پس ماندہ ملکوں میں گداگروں کی بہتات ہے، جو شہر کے بازاروں اور چوکوں پر گزرتے لوگوں کو اپنی غربت اور بے بسی کا حال سنا کر ان سے خیرات کا مطالبہ کرتے ہیں، گداگروں کا طبقہ کسی بھی معاشرے کی مذہبی اور سماجی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ امیر و غریب کے طبقاتی فرق کی بھی علامت ہے۔ یہ لوگوں کے انسانی جذبات کو اُبھار کر ان سے خیرات طلب کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ گداگر اپنی توانائی اور صلاحیتوں کو ضائع کر کے معاشرے کے لئے ایک بوجھ بن جاتے ہیں۔

زائرین

ہر مذہب میں زیارت کے مقامات ہوتے ہیں کہ جہاں لوگ ثواب کی خاطر یا اپنے گناہوں کی تلافی کے لئے یا خواہشات کے پورا ہونے کے لئے سفر کرتے ہیں۔ ہندو اور بدھ مذہب کی یہ زیارت گاہیں عام طور سے اونچے پہاڑوں یا گھنے جنگلات میں ہوتی ہیں۔ جہاں لوگ پُر پیچ راستوں اور گزرگاہوں سے گزر کر زیارت کرتے ہیں اور روحانی سکون حاصل کرتے ہیں۔

انگلستان میں زائرین کے بارے میں چاسر کی Tells of Conterbery میں ان زائرین کے کاروان یا قافلے کا ذکر ہے کہ جو زیارت کے لئے Conterbery جا رہے ہیں جہاں تھامس بیکٹ Thomas Becket کا مزار ہے جسے ہنری دوم انگلستان کے بادشاہ نے قتل کروا دیا تھا۔ چرچ نے اسے ''سینٹ'' کا درجہ دیا جس کی وجہ سے اس کا مزار زیارت گاہ بن گیا۔

یورپ میں مقدس زیارت گاہیں جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھیں جہاں لوگ قافلوں کی شکل میں جایا کرتے تھے۔ عہد وسطیٰ میں چرچ کے عہدیداران لوگوں کو کہ جن کے عقائد کے بارے میں انہیں شبہ ہوتا تھا انہیں بطور سزا کسی دور دراز مقام پر واقع زیارت کا حکم دیتے۔ تاکہ وہ راستے کی مشکلات اور صعوبت برداشت کریں۔

مزاروں کے علاوہ لوگ مقدس تبرکات کی زیارت بھی کرتے تھے۔ یورپ کے چرچوں میں یہ تبرکات ان کے اولیاء کے جسم کی ہڈیاں محفوظ ہیں۔ زائرین جس تقدس لگاؤ اور عقیدت سے زیارت گاہوں پر آتے ہیں تو ان میں اُمید اور حوصلہ ہوتا ہے کہ صاحب مزار ان کا سرپرست

ہے ان کی خواہشات کو پورا کرنے والا ہے۔ یہ احساس ان کو زندگی کی تمام محرومیوں اور استحصالی نظام کی اذیت برداشت کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس فاقہ زدگی کی حالت میں مجبور اور غریب آدمی جب اپنی محنت کی کمائی ہوئی رقم سے نذرانہ دیتا ہے تو اس کو شاید یہ اطمینان اور سکون ملتا ہے کہ اس نذرانے کی بدولت اسے زندگی میں کچھ خوشحالی اور مسرت مل جائے گی۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ میں زیارت گاہوں کا کیا کردار رہا ہے اور ہزارہا زائرین جو ہر عہد اور دور میں ان مقامات کی زیارت کو آتے ہیں کیا ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔

تاریخ ان گمنام زائرین کی عقیدت اور اس کی والہانہ محبت کا احساس کرتے ہوئے ان کی سماجی زندگی کا جائزہ لے، اور دیکھے کہ ان زائرین نے تاریخ کی تشکیل میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

معذور لوگ

معذور لوگوں کو معاشرے میں ایک بوجھ سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہ پیداواری عمل میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ اس لئے وہ معاشرے کہ جن کے معاشی وسائل محدود تھے وہ معذور لوگوں کو برداشت نہیں کرتے تھے مثلاً یونان کی ایک قدیم ریاست اسپارٹا میں یہ دستور تھا کہ نوزائیدہ بچے کو ایک کونسل کے سامنے پیش کیا جاتا تھا جس کے اراکین یہ جائزہ لیتے تھے کہ بچے میں کوئی جسمانی نقص تو نہیں ہے۔ اگر اس میں کوئی کمزوری یا نقص ہوتا تو اسے پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر مروا دیا جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسپارٹا کے جنگجو معاشرے کو صحت منداور طاقتور لڑکوں کی ضرورت تھی جو لڑاکو یا جنگجو بنیں۔

بیسویں صدی کے ایک انگریز سائنس داں نے یوجین کا نظریہ پیش کیا۔ جس کے تحت صحت مند نسل پیدا کی جائے۔ اس پر سوئیڈن میں عمل ہوا۔ بعد میں ہٹلر نے اس کو اپناتے ہوئے صحت مند جرمن نسل کے لئے ضروری قرار دیا کہ ذہنی اور جسمانی کمزور لوگوں کو ختم کر دیا جائے اور خالص جرمن نسل تیار کی جائے۔

کچھ تہذیبوں میں لڑکیوں کی پیدائش کو پسند نہیں کیا جاتا تھا اور انہیں پیدائش کے بعد کسی مقام پر چھوڑ دیا جاتا تھا جہاں سے یا تو کوئی بے اولاد خاندان انہیں لیجاتا تھا یا پھر وہ بھوک اور موسم

کی سختی سے دم توڑ دیتی تھیں۔

جو لوگ ذہنی مریض ہوتے تھے برصغیر ہندوستان میں ان کے بارے میں یہ شہرت ہو جاتی تھی کہ وہ روحانی طور پر پہنچے ہوئے لوگ ہیں۔ اس صورت میں لوگ ان کا خیال کرتے تھے اور ان سے ڈرتے بھی تھے۔ دوسری صورت میں انہیں علاج کی غرض سے مزاروں پر لیجایا جاتا تھا جہاں وہ زنجیروں میں بندھے بے بسی کی حالت میں رہتے تھے یہ صورتِ حال آج بھی ہے۔

اکثر عورتیں اگر ذہنی طور پر بیمار ہوں تو یہ کہا جاتا تھا کہ ان پر جن آ جاتے ہیں۔ جنوں کو اُتارنے کے لئے عاملوں اور مذہبی لوگوں کا ایک گروہ ہوتا تھا جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ جنوں کو قابو میں لے آتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں سائنس، ٹیکنالوجی اور علم نفسیات میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اگر معذور لوگوں کو مواقع دیئے جائیں تو وہ معاشرے کے لئے بوجھ نہیں بنیں گے بلکہ اس کی ترقی میں برابر کا حصہ لیں گے۔ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے اب معذور لوگ زندگی کے ہر شعبے میں باعمل ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال مشہور سائنس داں اسٹیفن ہاکنس ہے۔ جب معذور لوگ معاشرے کے عمل میں حصہ لیتے ہیں تو ان کی حیثیت دوسرے عام صحت مند لوگوں کی طرح ہوتی ہے۔ موجودہ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ جن میں ایک ہیلن کیلر جو نابینا، گونگی اور بہری تھی لیکن اس کے باوجود اس نے بھرپور زندگی گزاری، یونان کا قدیم شاعر ہومر، انگلستان کا شاعر ملٹن اور عربی کا شاعر ابوالعلا معرّی بھی نابینا تھے مگر ان کی شاعری ادب کا ایک بڑا حصہ ہے۔

گھریلو ملازمین

تاریخ میں گھریلو ملازمین اور ان کے کام کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ یہ گھریلو ملازمین ہر اس تہذیب میں موجود رہے ہیں کہ جہاں امیر اور غریب کا طبقاتی فرق تھا۔ امراء کے گھروں کے یہ ملازمین کھانا پکانے سے لے کر گھر کی صفائی اور مالک یا مالکن کے ہر حکم کی تعمیل بجالاتے ہیں۔ پہلے کے زمانے میں امراء کے حرم میں مغلانیاں، کنیزیں اور نوکرانیاں ہوتی تھیں لیکن جاگیردارانہ کلچر کا ایک پہلو یہ تھا کہ گھریلو ملازمین نسل درنسل ایک ہی خاندان کی خدمت کرتے تھے، اور اس

سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ اگر مالک اچھا ہوتو گھریلو ملازمین خاندان کا فرد بن جاتے تھے۔ دوسری صورت میں ان کا استحصال کیا جاتا تھا۔

پاکستان کے جاگیردارانہ معاشرہ میں گھریلو ملازمین اور ان کے کام کی عزت نہیں ہے، حالانکہ یہ لوگ چوبیس گھنٹے گھریلو کام کاج میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے مالکان کو فرصت کے لمحات مہیا کرتے ہیں جبکہ خود ان کی زندگی یکسانیت کا شکار ہوکر بوریت کا باعث ہوجاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ میں ان کی روزمرہ کی زندگی کے بارے میں تحقیق کی جائے اور اس کی نشاندہی کی جائے کہ ان کی موجودگی سے معاشرے کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر کیا اثرات ہوتے ہیں۔

سندھ کے شیدھی لوگ

سندھ میں افریقہ سے لائے ہوئے غلام شیدھی کہلاتے ہیں۔ ان افریقیوں کو زنجبار سے بطور غلام مکران لایا جاتا تھا۔ وہاں سے یہ سندھ میں آتے تھے جہاں سندھ کے میر اور وڈیرے انہیں خرید کر بطور خدمت گار رکھتے تھے۔ سندھ کے کافی شہروں میں شیدھیوں کے اپنے محلے ہیں۔ کچھ ایسے گاؤں بھی ہیں جہاں ان کی اکثریت ہے۔ ان کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ ایک تو ایک شیدھی استاد کہ جس کا نام صدیق تھا انہوں نے اپنی سوانح حیات میں سندھ کے شیدھیوں کے بارے میں لکھا ہے۔ خورشید قائم خانی اور ڈاکٹر فیروز نے اپنے مضامین میں شیدھیوں کے بارے میں کچھ تحقیق کی ہے۔

لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے بارے میں پوری تحقیق کی جائے کہ ان کو کب تک بطورِ غلام لایا جاتا رہا ہے اور سندھ میں آنے کے بعد جب یہ سندھ کے حکمراں میروں، وڈیروں اور پیروں کے یہاں رہے تو بحیثیت خدمت گار کے ان کا کیا مقام تھا اور کن کن مراحل کے بعد یہ سندھ کے معاشرے میں ضم ہوکر سندھی بن گئے۔

لیکن اس تبدیلی کے باوجود افریقی کلچر کے نشانات ان کے اجتماعی شعور کا حصہ ہیں۔ جس کا اظہار ان کی موسیقی، رقص اور گانوں سے ہوتا ہے۔ تاریخ کے ان گمنام لوگوں کو ان کا جائز اور صحیح مقام دینے کی ضرورت ہے۔

دلت یا اچھوت لوگ

برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں دلت یا اچھوت ہندو مذہب کی چار ذاتوں سے باہر ہیں۔ اس لئے سماج میں ان کا سب سے نچلا مقام ہے۔ جب انہیں سماج انسان ماننے کو ہی تیار نہیں تو تاریخ میں جگہ لینا ناممکن ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صدیوں سے ناانصافی اور غیر مساوی سلوک کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کو حرام سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ذات کو نجس قرار دیا جاتا ہے۔ گندگی اور غلاظت کو اُٹھانے اور صفائی کا کام کرنے سے ہی ان کی ذات غیر انسانی ہوگئی۔

قدیم عہد اور عہدِ وسطیٰ میں یہ لوگ شہر سے باہر رہا کرتے تھے اور شہروں میں صرف صفائی کے کام کے لئے آتے تھے۔ اس طرح ان کی اپنی ایک علیحدہ دنیا تھی۔ نہ ان کا تعلق ریاست سے تھا اور نہ تاریخ سے۔ مذہب کی تبدیلی کے باوجود ان کا سماجی درجہ تبدیل نہیں ہوا۔

سندھ میں بھیل، کولی اور میگواڑ قبائل کو نچلی ذات کا درجہ دیا جاتا ہے اور گاؤں کے ہوٹلوں میں ان کے کھانے پینے کے برتن علیحدہ ہوتے ہیں۔

پنجاب میں چنگڑ، چوڑا اور اسی طرح دوسرے قبیلوں کو سماج سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کے کام کی حیثیت کو معاشرے میں اہم نہیں سمجھا جاتا ہے یا اس کو نظرانداز کر کے انہیں پستی کی حالت میں رکھا جاتا ہے تاکہ وہ تسلسل کے ساتھ ایک ہی ذات میں گرفتار معاشرے کی خدمت کرتے ہیں لیکن ان کی خدمت کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کے مورخوں نے دلت ذات کے تاریخی کردار کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے مثلاً 1857ء کی جنگِ آزادی میں ان کی سرگرمیوں کو تاریخ کے دائرے میں لایا گیا ہے۔ لیکن پاکستان کی تاریخ میں یہ دلت منتظر ہیں کہ مورخ ان کو پستی اور ذلت سے نکال کر ایک باعزت مقام دیں۔

آخر میں پاکستان کے مورخوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان گمنام لوگوں کے بارے میں تحقیق کریں۔ ان کی روزمرہ کی زندگی کو اُجاگر کریں، ان کی محرومیوں کا اندازہ لگائیں، ان کے جذبات و احساسات کو محسوس کریں اور تاریخ کی تشکیل کرتے ہوئے اس کی نشاندہی کریں کہ تاریخ طاقت ور اور بااقتدار لوگ ہی نہیں بناتے ہیں بلکہ اس کی تشکیل کے پیچھے ہزارہا گمنام لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو تاریخ کی تکمیل کرتے ہیں۔ جب تک ان گمنام لوگوں کے کام اور تاریخ کے عمل میں ان

کی شرکت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک تاریخ نامکمل رہے گی۔

گمنام لوگوں کی تاریخ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ طاقت کے تصور کو بدلا جائے۔ طاقت کا وہ تصور کہ جس کا تعلق اقتدار اور سیاست سے ہے جو معاشرے میں جنگ و جدل پیدا کرتا ہے۔ سماج کو طبقات میں تقسیم کرتا ہے اس کی جگہ اس عوامی طاقت کا اظہار کیا جائے کہ جو سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ معاشرے کو متحرک رکھتا ہے ان کی روزمرہ کی زندگی تاریخ کی رفتار کو آگے بڑھاتی ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو تاریخ کی وسعت کے ساتھ تشکیل کرتی ہے۔ اس لئے ایک ایسی تاریخ ہی لوگوں میں شعور اور آگاہی پیدا کر کے ان میں مزاحمت اور تبدیلی کے جذبات کو پیدا کرتی ہے۔

روشن خیالی کی تحریک

روشن خیالی کی تحریک نے یورپ کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔اس سے ایک سبق یہ ملتا ہے کہ خیالات، افکار، اور نظریات کس طرح سے ایک جامد، رکے ہوئے، اور قدامت پرست روایات سے سوسائٹی کو نکال کر آگے کی جانب لے جاتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر نئے افکار کیوں جنم لیتے ہیں؟ یہ بھی معاشرے کے اندرونی سیاسی، سماجی اور معاشی وجوہات کی بنیاد پر پیدا ہوتے ہیں۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تبدیلی کو آسانی سے تسلیم نہیں کرلیا جاتا ہے کیونکہ موجودہ نظریات کے گرد ایسے گروہ اور جماعتیں ہوتی ہیں کہ جن کے مفادات ان روایات اور اداروں سے جڑ جاتے ہیں، اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ نئے خیالات پر پابندیاں لگائی جائیں اور ان کی اشاعت کو روکا جائے۔لیکن جب معاشرہ میں تبدیلی کی خواہش شدید ہوتی ہے اور یہ تبدیلی اس کی سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کے لئے ضروری ہو جاتی ہے تو پھر نئے افکار کو روکنے کی تمام کوششیں اس کے نتیجے میں دم توڑ دیتی ہیں۔

کیونکہ یورپ عہد وسطیٰ میں چرچ کے تسلط میں تھا، مذہبی خیالات اور عقائد معاشرے کی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ان سے انکار کفر تھا کہ جس کی سزا انتہائی سخت تھی۔الٰہیاتی نقطہ نظر کے تحت زندگی کے ہر شعبے کو دیکھا جاتا تھا۔ماضی کی بنیاد پر تمام روایات اور اداروں کو پرکھا جاتا تھا، اور ماضی کی اتھارٹی پر اس قدر یقین تھا کہ تمام روایات اور ادارے ماضی کی تجربہ گاہ سے نکل کر آئے ہیں اس لئے خیال یہ تھا کہ ان کی بنیاد پر ہی معاشرہ کو قائم رہنا چاہئے۔ماضی کے افکار اور روایات سے انکار معاشرے میں بدامنی پیدا کرنے کے مترادف تھا۔دوسرے یہ کہ سچائی کو مذہبی عقیدے کے تحت تسلیم کرلیا گیا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ آفاقی حقیقت ہے۔ جب ایک مرتبہ سچائی کو آفاقی اور ابدی مان لیا گیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اب نئی تحقیق کی کوئی ضرورت

نہیں ہے۔علم اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔

سترھویں صدی میں یورپ کے معاشرے میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی۔ ریاست اور اس کے اداروں میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ یورپی تاجر دنیا کے دوسرے ملکوں میں جا رہے تھے اور وہاں ان کا رابطہ دوسری اقوام کے کلچر سے ہو رہا تھا۔ اس لئے نئے بدلتے حالات میں عہد وسطیٰ کے خیالات اور ادارے ان کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ اس لئے یورپ کے دانشوروں اور سائنسدانوں نے ان نظریات کے خلاف آواز اٹھائی، اور ان کی جگہ نئے افکار کی تخلیق کی۔

ان نئے افکار میں سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ سچائی کو عقیدے کی بنیاد پر تسلیم نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس کے لئے استدلال، مشاہدات، اور تجربات کی ضرورت ہے، چنانچہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں سائنسدانوں نے جن میں کوپرنیکس، کیپلر، گلے لیو، وغیرہ شامل تھے انہوں نے زمین کے گول ہونے اور اس کے گردش کے نظریہ کو سائنسی بنیادوں پر ثابت کر کے مذہبی نظریہ کو چیلنج کیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیچر یا فطرت کا مطالعہ اب مذہبی نقطہءنظر سے نہیں ہونے لگا، بلکہ اسے مذہب سے جدا کر کے علیحدہ طور پر اس پر تحقیق کی گئی اور کوشش کی گئی کہ اس کے رازوں سے پردہ اُٹھایا جائے۔

فطرت کے اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئے مذہبی نقطہءنظر کا آغاز ہوا جسے ڈے ازم کا نام دیا گیا، فلسفیوں نے استدلال کیا کہ خدا کو سمجھنے اور اس کی ذات کی برتری کو جاننے کے لئے فطرت کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مذہبی کتابوں کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب خدا کو مذہبی کتابوں کے ذریعہ جانا جاتا ہے تو وہ کسی ایک مذہب یا فرقہ کا خدا ہو جاتا ہے۔ لیکن فطرت کی کتاب میں خدا یونیورسل شکل میں اُبھر کر آتا ہے جو تمام کائنات اور تمام انسانوں کا ہے۔ اس نظریہ نے مذہبی انتہا پسندی اور بنیاد پرستی پر ایک زبردست وار کیا، اور اس کی جگہ رواداری کی بنیاد رکھی، کہ جس میں ہر مذہب اور عقیدے کے لوگوں کے لئے جگہ تھی۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں سائنسدانوں نے فطرت کے بارے میں جو تحقیق کی اس سچائی سے یہ ثابت ہوا کہ یہاں کوئی اٹل اور آفاقی نہیں ہے، کیونکہ ایک تجربہ، استدلال اور مشاہدات کی بنیاد پر کسی حقیقت کو ثابت کیا جاتا ہے، مگر اس کے بعد دوسرا تجربہ اس کو رَد کر دیتا ہے اور نئے شواہد کے ساتھ ایک دوسری حقیقت کو سامنے لے آتا ہے، اس نے یہ ثابت کیا کہ سچائی

جامد نہیں ہے بلکہ یہ برابر بدلتی رہتی ہے۔ ہر شے کے اندر اس کا رَد چھپا ہوتا ہے، جو کسی اور تجربہ کے بعد اس کو غلط ثابت کر کے دوسری حقیقت کو سامنے لے آتا ہے، اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

روشن خیالی کی تحریک میں افکار اور نظریات کے بارے میں دو نقطہائے نظر اُبھر کر سامنے آئے۔ ایک یہ تھا کہ کسی بات کو بغیر استدلال کے تسلیم نہیں کرنا چاہیئے، اور اول اول اس کو شک و شبہ کی بنیاد پر پرکھنا چاہیئے، جب کسی چیز پر یقین نہیں ہوگا اور اس پر شک کیا جائے گا تو اس کے نتیجہ میں اور زیادہ تحقیق اور جستجو ہوگی، جو نئے خیالات کی دنیا کو وسعت دے گی۔

دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ جب یورپی اقوام کا رابطہ دنیا کی دوسری قوموں سے ہوا تو انہیں نئی تہذیب، کلچر اور ان کے مختلف قسم کے رسم و رواج سے واسطہ پڑا۔ اس نے ان میں اس احساس کو پیدا کیا کہ ان کی تہذیب ہی واحد تہذیب نہیں ہے کہ جسے اعلیٰ و برتر سمجھا جائے، دوسری قوموں کے رسم و رواج کا تعلق، ان کے کلچر سے تھا، اس نے ان میں اضافیت یا (Relativism) کا فلسفہ پیدا کیا کہ ہر کلچر، تہذیب، اور اس کے رسم و رواج کو سمجھنا چاہیئے، اور کسی چیز کو آفاقی اور ابدی نہیں تسلیم کرنا چاہیئے۔ دنیا کی تہذیبوں کے مطالعہ کے بعد یورپ کے فلسفی اور مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہر تہذیب ارتقائی منازل سے گذر کر ایک خاص مرحلہ پر پہنچی ہے۔ لہٰذا مذہب، عقیدہ، رسم و رواج، یہ سب ارتقاء کے نتیجہ میں تشکیل پائے ہیں، جب ہر چیز حرکت میں ہے، اور ساکت نہیں ہے تو اس کے بارے میں ایک رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے۔

فرانس میں فلسفی جو فلوسوف کہلاتے تھے، انہوں نے نئے خیالات کی تشکیل میں حصہ لیا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ 17 جلدوں میں لکھی گئی انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں تقریباً ہر موضوع پر مقالات ہیں، ان مقالات کو لکھنے والے ڈیڑھ سو اسکالرز تھے جنہوں نے اپنے خاص موضوعات پر لکھا، ڈڈرو (Didro) اس کا ایک اہم ایڈیٹر تھا۔ اس میں ٹیکنالوجی پر خاص طور پر توجہ دی گئی، اور مضامین کے ساتھ مشینوں اور آلات کے ڈائی گرام بھی شامل کیئے گئے۔ انسائیکلو پیڈیا کا بنیادی مقصد سماج میں ذہنی تبدیلی لانا تھا۔ اس کے ایڈیٹرز کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا سے علم ختم ہو جائے اور یہ کتاب باقی رہ جائے تو وہ انسانی ترقی کے لئے کافی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کے کئی اصلی اور جعلی ایڈیشنز چھپے اور یہ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبول ہوئے۔ فرانس میں کتابوں پر سنسر شپ تھا، اور کوئی ایسی کتاب کے جس میں چرچ یا حکومت کے خلاف مواد ہوتا تھا تو اس پر پابندی لگا دی جاتی تھی، مگر

پابندی کی وجہ سے اس کتاب کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔سنسر شپ کی سختی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ متنازعہ کتابوں کو آگ میں جلایا جاتا تھا۔روسو کی کتاب ایملی (Emeli) کو اس لئے جلایا گیا کہ اس میں راہبوں کے بارے میں تنقید تھی۔

روشن خیالی کی اس تحریک میں انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی اور ہالینڈ کے فلسفیوں اور مفکرین نے حصہ لیا، اپنے خیالات سے تحریک کو آگے بڑھایا۔ چرچ، مذہبی عقائد، انسان کی آزادی اور اخلاقیات کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا، اور ہر موضوع کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا۔یورپ کے پبلشنگ اداروں نے ان کی کتابوں کی اشاعت کر کے انہیں پھیلایا۔کافی ہاؤسز اور سیلونوں (Slons) میں دانشوروں کے بحث ومباحثہ نے نئے افکار کو مقبول بنانے میں حصہ لیا۔

روشن خیالی کی تحریک نے یورپ کی تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے۔تبدیل ہوتے ہوئے مفکرین اور فلسفیوں کے افکار نے معاشرے میں کئی نئی تحریکوں کو پیدا کیا، جن کی وجہ سے ان کے ہاں سے چرچ کا تسلط ختم ہوا، مذہبی انتہا پسندی کا زور ٹوٹا، سنسر شپ اور آزادی تحریر وتقریر پر پابندیاں اُٹھیں۔صنعتی انقلاب نے فیوڈل کلچر کا خاتمہ کیا، تو فرانسیسی انقلاب نے سیاسی نظام کو تبدیل کر کے ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے جدا کیا، تعلیم جواب تک چرچ کے پاس تھی اور اس کی ذمہ داری ریاست کی ہوگئی جس کی وجہ سے اس کا نصاب سیکولر ہو گیا۔

1830ء اور 1848ء کے انقلابات نے دستور کی اہمیت کو بڑھایا، اور جمہوری اداروں اور روایات کا پھیلاؤ ہوا۔قوم پرستی کی تحریک نے قوموں میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کیا۔اس کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب اور فرقوں کے درمیان رواداری کی فضا تیار ہوئی۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی دریافتوں اور ایجادات نے ایک جانب فطرت کو سمجھنے کے مواقع فراہم کئے، تو دوسری جانب انہوں نے لوگوں کو سہولتیں فراہم کر کے زندگی میں سہولتیں پیدا کیں۔دوصدیوں میں یورپ عہد وسطیٰ کی پس ماندگی، اور ذہنی تنگنائی سے ہٹ کر، آزادی اور اعتماد کے دور میں داخل ہوا کہ جس میں فرد کو زندگی کا نیا مفہوم ملا۔

روشن خیالی کی یہ تحریک دنیا کے دوسرے ممالک کے لئے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس تحریک کو اختیار کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں یورپ کی طرح کی ترقی ہوسکتی ہے اور انہیں پس ماندگی سے نکالا جاسکتا ہے۔

جب پاکستان کے دانشور، روشن خیالی کی تحریک کی بات کرتے ہیں، اور اس کے لئے اپنی تاریخ اور کلچر میں ان جڑوں کو دریافت کرتے ہیں کہ جن کی بنیاد پر اس تحریک کو ابھارا جائے، تو ان کے سامنے دو مثالیں ہوتی ہیں، اوّل، وہ برصغیر ہندوستان میں صوفیاء کے اقوال اور ان کی زندگی سے مذہبی رواداری کے جذبات تلاش کرتے ہیں، یا پھر شاعری کے اندر اس طنز و مزاح کو ڈھونڈتے ہیں کہ جو شاعروں نے مذہبی روایات، واعظوں، مولویوں اور زاہدوں پر کئے ہیں۔

اس سلسلہ میں اگر یورپ کی روشن خیالی کا مطالعہ کیا جائے، تو ایک بات تو واضح ہے کہ ان کی تحریک میں ماضی سے انکار ہے، وہ ماضی کے اس سحر کو توڑ رہے تھے کہ جس میں معاشرہ گرفتار تھا، وہ قدیم روایات اور عقائد سے انحراف کرتے ہوئے نئے خیالات اور نظریات تخلیق کر رہے تھے۔ چاہے یہ تخلیق سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہو یا سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں۔ اس لئے ان کے مفکرین اور دانشور حال کے حالات کو تبدیل کرتے ہوئے مستقبل کے لئے ایک نئی دنیا تسلیم کر رہے تھے۔ اس میں نئی جدت اور تخلیقی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، حال کو سمجھنا، اور آنے والے زمانہ کی ضرورتوں کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے دانشوروں میں نئے خیالات اور افکار پیدا کرنے کی تخلیقی صلاحیت نہیں ہے جو لوگوں کو قدامت سے نکال کر خاص طور پر نئے حالات کے چیلنجوں کو قبول کرنے پر آمادہ کریں۔

اس لئے یہ کوشش کہ ماضی میں جا کر صوفیاء کے خیالات اور شاعرانہ انداز بیان کو لے کر معاشرے میں تبدیلی لائیں تو یہ سعی لا حاصل ہے، کیونکہ صوفیاء کی تعلیمات ایک خاص عہد، اور پس منظر میں موثر تھیں، جو آجکل کہ حالات میں غیر موثر ہو کر رہ گئی ہیں، اور اب ان کی حیثیت محض رسمی ہو گئی ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو وہ تفریح کا باعث ضرور ہے، مگر وہ گہری سوچ اور فکر کو پیدا نہیں کر سکتی ہے۔

پاکستان میں روشن خیالی کی تحریک کے سامنے جو رکاوٹیں اور مشکلات ہیں، ان میں جاگیردارانہ نظام، اور اس کا کلچر، قبائلی روایات، عقائد میں انتہا پرستی، اس لئے جب تک یہ رکاوٹیں دور نہیں ہوں گی، اس وقت تک معاشرے میں نئے خیالات کے لئے جگہ نہیں ہوگی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان دانشور اور مفکر لوگوں میں قدامت پرست رویوں کے خلاف ان کو ذہنی طور پر آمادہ کریں کہ یہ ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ جمہوریت میں عوام کی آواز کی

اہمیت ہوتی ہے، اگر ان کے خلاف عوام کی آواز اٹھتی ہے تو سیاسی جماعتوں کو بھی مجبور ہونا پڑے گا کہ وہ اس کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بنائیں۔

لیکن پاکستان کے دانشوروں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جدیدیت یا روشن خیالی پرانے نظریات اور افکار کے ساتھ نہیں آسکتی ہے، اس کے لئے نئے افکار کی تخلیق ضروری ہے۔

ہمارے پاس ماضی کے سرمایہ میں وہ روایات اور نظریات نہیں کہ جن کی مدد سے ہم ترقی پسند سوچ کو اُبھار سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دانشوروں اور مفکروں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، نئے افکار کی تخلیق کے عمل سے گذرنا ہوگا، اور لوگوں میں جو تبدیلی کی خواہش ہے اسے بیدار کر کے اپنے لائحہ عمل سے ان کو سرگرم کرنا ہوگا۔ اس صورت میں معاشرہ نہ صرف تبدیل ہوگا، بلکہ ترقی کے راستہ پر بھی چل پڑے گا۔

سرمایہ داری کی ابتداء

تاریخ میں تاجروں کا اہم کردار رہا ہے۔ تاریخ کے ابتدائی زمانے سے یہ لوگ اپنا سامان تجارت لے کر دوسرے ملکوں اور علاقوں میں جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب ذرائع نقل وحمل ابتدائی دور میں تھے۔ راستے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ڈاکوؤں اور وحشی قبائل کی لوٹ مار کا خطرہ بھی ہوتا تھا، مگر ان تمام مشکلات کو منافع کے جذبہ کے تحت برداشت کیا جاتا تھا۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا منافع سونے کی شکل میں ہو۔ جو ان کی دولت کو محفوظ رکھے۔ اس لئے عہد قدیم، اور عہد وسطیٰ میں سونے کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ تاجر اور قومیں سونا جمع کر کے اپنی دولت اور طاقت میں اضافہ کرتی تھیں۔ کولمبس کہا کرتا تھا کہ سونا ایک ایسی قیمتی چیز ہے کہ جس کی مدد سے جنت کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔

سرمایہ داری کے اس نظام کو عہد وسطیٰ میں مرکنٹائل، کیپٹل ازم کہا جاتا تھا۔ اس میں تاجر ایک جگہ سے سستا مال خرید کر دوسری جگہ مہنگے داموں فروخت کر کے منافع کمایا کرتے تھے، مثلاً عہد وسطیٰ میں جب یورپی تاجر ہندوستان میں آئے تو ان کے پاس تو یورپ سے لا کر فروخت کرنے والا کوئی سامان نہیں تھا، یہاں سے یہ کپڑا، مسالے اور نیل خریدتے تھے اور چاندی کی شکل میں اس کی قیمت ادا کرتے تھے مگر جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا، تو اس نے سرمایہ داری کی شکل بدل ڈالی اور انڈسٹریل کیپٹل ازم نے پہلے انگلستان میں سیاسی وسماجی تبدیلیاں کیں اور پھر یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس کے اثرات ہوئے۔ اب یہ اپنا مال فیکٹریوں میں تیار کر کے دوسرے ملک کی منڈیوں میں فروخت کے لئے بھیجتے تھے، اور اس سے منافع کماتے تھے۔

صنعتی انقلاب نے جہاں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کو پیدا کیا، وہیں اس نے معاشرے میں سرمایہ دار اور مزدور دو طبقوں کو تشکیل کیا۔ اس طبقاتی تقسیم نے معاشرے میں معاشی اور سماجی

ناہمواری اور غیر مساویانہ روایت کو آگے بڑھایا۔ اس ابتدائی دور میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ 18 یا 19 گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا، ان میں عورتیں اور بچے بھی ہوا کرتے تھے۔ مزدوروں کی بستیوں میں نہ تازہ ہوا اور صاف پانی کی سہولت تھی، نہ گندے پانی کے نکاس کا کوئی ذریعہ تھا۔ کام کی زیادتی، غذا کی کمی، اور ماحول کی وجہ سے یہ بیمار اور نحیف لوگ جلد ہی زندگی کی بازی ہار جاتے تھے۔

لہٰذا صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری نے نئے نظریات اور خیالات کو پیدا کیا۔ ان میں وہ فلسفی، مفکر اور سماجیات کے ماہرین تھے جو اس نظام کی حمایت کرتے ہوئے، اس کی بنیادوں کو مضبوط اور مستحکم بنانا چاہتے تھے۔ دوسری جانب صاحب علم تھے جو اس کی خرابیوں سے لوگوں میں آگہی اور شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سرمایہ داری کی حمایت میں سب سے اہم نام آدم اسمتھ (Adam Smith) کا ہے کہ جس نے اپنی کتاب ویلتھ آف نیشن (Wealth of Nation) میں اس نظام کے خدوخال کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

آدم سمتھ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا، اور تعلیم کے حصول کے بعد یہ گلاسکو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ایک امیر نے زیادہ تنخواہ پر اپنے بیٹے کا استاد ہونے کی دعوت دی، جو اس نے قبول کر لی، اس وقت دستور یہ تھا کہ طالب علم براہ راست استاد کو فیس ادا کرتے تھے چونکہ یہ وقت سے پہلے ملازمت چھوڑ رہا تھا، اس لئے اس نے طلباء سے کہا کہ وہ ان کی آدھی فیس واپس کرنا چاہتا ہے۔ اس پر طلباء نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اس نے انہیں اب تک جو پڑھایا ہے، اس سے ان کی فیس وصول ہو گئی۔

امیر کی ملازمت کے دوران اس نے یورپ کی سیاحت کی، اور خاص طور سے فرانس میں وہاں کے معیشت دانوں سے ملاقاتیں ہوئیں، اور معیشت کے بارے میں ان کے نظریات سے آگہی ہوئی۔ یہ لوگ فری مارکیٹ کے حامی تھے کہ جس میں ریاست کے عمل دخل کو رَد کرتے تھے۔ لہٰذا واپسی پر اس نے اپنی کتاب اوریجن آف ویلتھ آف نیشن لکھی، اس میں اس نے جن اہم امور پر بحث کی ہے وہ یہ ہیں:

1- تقسیم کار: اب تک یہ دستور تھا کہ ایک فرد اپنے پیشہ میں رہتے ہوئے سارے کام خود کرتا

تھا،مثلاً موچی سارا جوتا خود تیار کرتا تھا، یا بڑھئی اکیلا میزاور کرسی بناتا تھا۔آدم اسمتھ کا کہنا تھا کہ اگر کام کو تقسیم کر دیا جائے تو اس صورت میں پیداوار کی شرح بڑھ جائے گی۔اس کی مثال دیتے ہوئے وہ پن بنانے کا ذکر کرتا ہے۔اگر ایک آدمی صبح سے لے کر شام تک پنیں بنائے تو وہ زیادہ سے زیادہ 50 یا60 پنیں بنائے گا۔اگر پن بنانے کے کام کو تقسیم کر دیا جائے تو چھ یا سات آدمی یہ کام کریں،تو اس صورت میں پیداواری شرح ہزاروں تک پہنچ جائے گی۔یہ تقسیم کار اب ہم فیکٹریوں میں دیکھتے ہیں کہ یہاں جوتا بنانے کی فیکٹری میں ایک چمڑا سیدھا کرتا ہے،دوسرا اسے کاٹتا ہے،تیسرا اس کے اوپر کا حصہ بناتا ہے چوتھا اس کا تلوا تیار کرتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں یہ تمام حصے مکمل ہو جاتے ہیں،اور جوتا پالش کے بعد تیار ہو جاتا ہے،لہٰذا تقسیم کار کے نتیجہ میں پیداوار بڑھ جاتی ہے۔

2- اس کا دوسرا اصول یہ تھا کہ صنعت کے اس نظام میں ریاست کو دخل دینا نہیں چاہئے۔تنخواہ کا مسئلہ ہو تو یہ صنعت کار اور مزدور مل کر طے کریں،ریاست اس سلسلہ میں کوئی قانون نہیں بنائے۔مارکیٹ کو تجارت کے سلسلہ میں آزاد ہونا چاہئے۔تحقیق کا تعلق اس پر ہو کہ ان کی مانگ کس قدر ہے اور کس قدر ان کی پیداوار ہے۔

3- سرمایہ داری میں آدم اسمتھ کے نظریہ کے مطابق، ذاتی فائدے کی اہمیت ہوتی ہے (Self interest)اس ذاتی غرض کے تحت افراد محنت سے کام کرتے ہیں،اور زیادہ سے زیادہ منافع کی کوشش کرتے ہیں۔

آدم اسمتھ نے اپنے ایک مضمون میں تقسیم کار کے منفی اثرات پر لکھتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ ایک فرد جب ایک ہی قسم کا کام کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کے لئے یہ کام غیر دلچسپی کا باعث ہو جاتا ہے۔وہ اسے بار بار دہراتا ہے،اور یہ کام بطور ایک مشین کے کرتا ہے۔اس کے علاوہ اس کی تخلیقی صلاحیت اور ذہانت ختم ہو جاتی ہے اس میں کسی قسم کی نئی سوچ اور فکر پیدا نہیں ہوتی ہے۔

صنعتی دور کے دو اہم مفکرین مالتھوس اور ڈیوڈ ریکارڈو تھے۔مالتھوس نے آبادی کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ معاشرے میں آبادی میں اضافہ جیومیٹری کی شکل میں ہے یعنی 2،4،8، 16، یہ تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے، جب کہ غذا کی پیداوار

ریاضی کی شکل میں ہے، یعنی 1، 2، 3، 4، اس کی وجہ سے آبادی اور غذا کے تناسب میں بے انتہا فرق ہوتا جارہا ہے، یہ فرق قحط، خشک سالی، وبا اور دوسری آفات سے ضرور کم ہوتا ہے، لیکن اس پر قابو پانا ضروری ہے۔

ڈیوڈ ریکارڈو (David Recardo) نے، سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لئے تنخواہ کے فولادی قوانین (Iron Rules of Wages) کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک مزدوروں کا اتنی تنخواہ دینی چاہئے کہ جس سے ان کا گذارا ہو جائے۔ اگر ان کو زیادہ تنخواہ دی گئی تو یہ زیادہ بچے پیدا کر کے آبادی میں اضافہ کریں گے۔ ریکارڈو کے ان نظریات کو یورپ اور امریکہ کے صنعت کاروں نے خوش آمدید کہا، کیونکہ اس سے انہیں فائدہ تھا۔

سرمایہ داری کے ان خیالات کی مخالفت میں بھی دانشوروں اور مفکرین نے آواز اٹھائی، اور ان پر گہری تنقید کی۔

صنعتی انقلاب اور ردِ عمل

جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا، تو اس کے نتیجہ میں جہاں سماجی اور معاشی تبدیلیاں آئیں، وہیں اس نے ماحولیات کو بری طرح سے اثر انداز کیا۔ فیکٹریوں کے قیام کے بعد صنعتی شہروں کا ماحول بدل گیا۔ مشینوں کا شوروغل، مزدوروں کی کچی آبادیاں اور ان میں صفائی کی سہولتوں کی کمی، کوئلہ سے چلنے سے مشینوں کا دھواں، جس نے فضا کو آلودہ کر دیا۔ کوئلے کے دھویں کی وجہ سے شہر کی عمارتیں کالی ہو گئیں۔ اس کا اثر لوگوں کی صحت پر بھی ہوا۔ خاص طور سے مزدور طبقہ جو 18 سے 19 گھنٹے کام کرتا تھا، فیکٹریوں میں، حفظانِ صحت کے انتظامات نہیں تھے جو ان کی صحت کو متاثر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اینگلز نے جو خود مانچسٹر میں ایک کپڑے کی مِل کا مالک تھا، انگلستان کے مزدوروں کی حالت زار پر کتاب لکھی، (Condition of Working Class in England) اور مزدوروں کی زندگی کے بارے میں جو نقشہ کھینچا ہے وہ انتہائی دردناک ہے۔ فیکٹریوں میں عورتیں اور بچے بھی کام کرتے تھے۔ بچے چھ سال کی عمر میں کام پر لگا دیئے جاتے تھے، آلودہ ماحول اور خراب غذا کی وجہ سے یہ ابتدائی عمر سے بیمار ہو جاتے تھے۔ فیکٹریوں کے مالکین کی جانب سے نہ پنشن تھی، نہ حادثہ کی صورت میں علاج و معالجہ کی سہولت، اور نہ بیروزگاری کی حالت میں کوئی سہارا، یہ ایک بھاری قیمت تھی جو مزدور اس انقلاب کی کامیابی کے لئے ادا کر رہے تھے جب کہ صنعت کار اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے منافع کما رہے تھے اور اپنی دولت میں اضافہ کر رہے تھے۔ لہٰذا مزدور اور معاشرہ دونوں اس صنعتی انقلاب کی قیمت چکا رہے تھے۔

ان حالات میں صنعتی انقلاب کے خلاف دو رجحانات پیدا ہوئے۔ ایک رجحان کا اظہار دانشوروں، شاعروں، اور مفکرین کی جانب سے آیا۔ ان کی تنقید تھی کہ اس عمل نے ماحول کو آلودہ

کر دیا ہے۔ صاف اور پاکیزہ فضا کوخراب کر دیا ہے۔شہروں کو بدصورت اورمسخ کر دیا ہے۔ معاشرے کےسکون اور اطمینان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔انہوں نے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس زراعتی معاشرے کی تصویر کشی کی کہ جس میں کھیتوں کی بہار تھی، پھولوں کی خوشبو تھی پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔لوگ اس ماحول میں سادہ زندگی گزارتے تھےاورصحت مند تھے۔انسان اورفطرت کے درمیان گہرا رشتہ تھا۔اس پُرسکون،خوبصورت، رومان پرور ماحول کوصنعتی عمل نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔اس لئے ان کی خواہش تھی کہ معاشرےکوایک بار پھر ماضی کی طرف لوٹنا چاہئےاورفطرت کی خوبصورتی کو بحال کرنا چاہئے۔فرد کی خوشی ومسرت کاتعلق،صنعتی عمل سےنہیں ہے بلکہ زراعتی معاشرےاوراس کے پُرامن ماحول سے ہے۔

صنعتی انقلاب کے بارے میں دوسرا ردِعمل سوشلسٹ نظریات رکھنے والوں کا تھا، جو اس پرتو متفق تھے کہ زمانہ جوآگےآ چکا ہے اسے واپس ماضی میں نہیں لوٹایا جاسکتا ہے۔لیکن اس صنعتی عمل نے جو امیر وغریب کے درمیان تفریق پیدا کی ہے، دولت کی غیرمساویانہ تقسیم کی ہے،مزدوروں کا استحصال کیا ہے،اس کو روکا جاسکتا ہےاورایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جاسکتی ہے جس میں مزدوروں کے حقوق کی حفاظت ہو،ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے،ان کی عزت وحرمت ہو،تاکہ صنعتی عمل سے جو سرمایہ پیدا ہو رہا ہے،اس میں سب برابر کے حصہ دار ہوں۔

اس تنقید پر صنعت کاروں کی دلیل یہ تھی کہ انہوں نے ترقی کی جانب ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔زراعتی معاشرے سے ملک کوصنعتی میں تبدیل کر کے پیداوار کےعمل کوتیز کیا ہے۔فیکٹریوں میں بیروزگار لوگوں کو ملازمتیں مہیا کی ہیں،تجارت کومرکنٹائل سرمایہ داری سے انڈسٹریل سرمایہ داری میں بدلا ہے،اس کےنتیجہ میں قومی دولت میں اضافہ ہوا ہے،اور ملک ترقی کرر ہا ہے۔

صنعتی انقلاب نے جس طرح مزدوروں کا استحصال کیا، دولت کی غیرمساوی تقسیم کے اصول کو اپنایا اور معاشرے میں سرمایہ دار اور مزدور طبقے کے درمیان فرق کو قائم کیا، ان کو دور کیا جاسکے۔

اس سلسلہ میں چندسوشلسٹ نظریات کے حامیوں نے اس نظام میں اصلاحات کومتعارف کرانے کی کوشش کی۔ان میں روبرٹ اوون (Robert Oven) جو ایک انگریز تھا اس نے

اسکاٹ لینڈ میں ایک ماڈل فیکٹری نیولونارک کے نام سے قائم کی۔اس فیکٹری میں مزدوروں کے اوقات کم تھے، ماحول کو صاف ستھرا اور آلودگی سے پاک رکھا گیا تھا، مزدوروں کی رہائش فیکٹریوں کے احاطے میں تھی۔ان کے بچوں کے لئے اسکول، اور کھیل کے میدان تھے، بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کی سہولت تھی۔روزمرہ کی اشیاء کی خریداری کے لئے کوآپریٹو سٹورز تھے۔اس ماحول میں مزدوروں نے زیادہ محنت اور دلچسپی سے کام کیا اور فیکٹری کی پیداوار دوسری فیکٹریوں کے مقابلہ میں زیادہ کی۔روبرٹ اوون نے اپنی اس ماڈل فیکٹری کی تشہیر اور تبلیغ کے لئے برطانوی پارلیمنٹ سے رجوع کیا اور کوشش کی کہ برطانوی ریاست اس ماڈل کو قبول کر کے دوسری فیکٹریوں کو اسی منصوبے کی بنیاد پر چلائے۔مگر اس میں اسے ناکامی ہوئی، اور اس کا یہ منصوبہ انگلستان میں اس لئے کامیاب نہیں ہو سکا کہ دوسرے صنعت کاروں نے اس کی مخالفت کی۔انگلستان سے مایوس ہو کر روبرٹ اوون نے امریکہ ریاست انڈیانا میں ہارمنی (Harmany) کے نام سے اپنی ماڈل فیکٹری قائم کی۔مگر جب وہ واپس انگلستان آیا تو اس کی غیر موجودگی میں یہ فیکٹری بھی زیادہ عرصہ نہیں چل سکی اور بند ہو گئی۔

فرانس کے دو سوشلسٹوں نے صنعتی انقلاب میں اصلاح کے لئے جو نظریات دیئے ان میں سے ایک سیس سائموں (Saint Simon) تھا، اگر چہ اس کا تعلق فرانس کے امراء کے طبقے سے تھا، مگر اس کی ہمدردی مزدوروں کے ساتھ تھی۔اس کے نظریات کے مطابق حکومت اور اس کے اداروں کو چلانے کے لئے امراء اور مذہبی طبقے کے لوگوں کو بالکل خارج کر دیا جائے، اور حکومت کے اختیارات ٹیکنو کریٹس، یعنی انجینئرز، ڈاکٹرز، اساتذہ، سائنسدان اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کو دیئے جائیں۔ٹیکنو کریٹس کی حکومت کا تصور اس نے دیا جو آج بھی ہمارے جیسے ملکوں میں، کبھی کبھی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن یہ سوال کہ یہ ٹیکنو کریٹس کیسے اقتدار میں آئیں اور کیسے حکومت کریں؟ اس کا جواب سیس سائموں کے پاس نہیں تھا۔یہ ایک تصور تھا کہ جس پر اس کے نزدیک عمل کر کے ایک ایسی حکومت قائم کی جا سکتی تھی کہ جو معاشرے میں استحصال کو ختم کرنے میں مدد دے گی۔

ایک اور فرانسیسی سوشلسٹ چارلس فیورے (Charles Feure) نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ایک ہزار چھ سو ایک کے لوگوں پر مشتمل ایک کمیون یا برادری قائم کی جائے۔اس کمیون میں

ہر شخص کو وہ کام دیا جائے کہ جس سے اس کی دلچسپی ہو۔ جیسے اگر کسی کو پھلوں میں دلچسپی ہے تو اسے باغ کا انچارج بنا دیا جائے، وغیرہ۔ کمیون میں عورت اور مرد کے درمیان برابری کو رکھنے کی تجویز تھی، تمام لوگ کام کریں گے اور آپس میں مل کر جو حاصل کریں گے اس میں شراکت ہوگی۔

اس کے نزدیک ایسی کمیون لوگوں کو سکون و اطمینان، خوشی و مسرت، اور شخصی آزادی دے گی۔ اس کی زندگی میں تو ایسی کمیون قائم نہیں ہوتی، مگر اس کے مرنے کے بعد امریکہ میں ایسی کوششیں ضرور ہوئیں، جو زیادہ کامیاب نہیں ہو سکیں۔

کارل مارکس ان کو یوٹوپیائی سوشلسٹ کہتا ہے، کیونکہ یہ نظام کو بدلنے کے بجائے، ان میں اصلاح کر کے یا اس میں رہتے ہوئے، علیحدگی کے ساتھ رہنے کے مسائل کا حل ڈھونڈ رہے تھے، جو اس لئے ناکام ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان کی گنجائش نہیں تھی۔ مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جب مسائل ہوں تو لوگ ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کی ناکامی سے دوسرے کامیاب حل کی جانب جایا جاتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے جو کوشش کیں، ان کو رَد نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے خیالات نے سائنسی سوشل ازم کی بنیاد رکھی۔

یورپ میں سرمایہ داری کا ارتقاء

یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کن حالات میں اور کن وجوہات کی وجہ سے وجود میں آیا، اس پر کئی مفکرین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان میں ایک جرمنی کا ماہر عمرانیات میکس ویبر (Max Weber) ہے، اس نے اپنی کتاب ''سرمایہ داری کا عروج اور پروٹسٹنٹ اخلاقیات'' (Rise of Capitalism and Protestant Ethics) میں تحریک اصلاح مذہب کے ریفامر جان کال ون (John Calvin) کے مذہبی نظریات کو وجہ قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق کال ون کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے انسان کی تقدیر کا فیصلہ ازل سے کرلیا ہے کہ کس کی نجات ہوگی اور کس کو سزا ملے گی۔ لہٰذا اس عقیدہ کے تحت انسان مجبور محض ہے۔ اس کے پیروکاروں میں اس عقیدے کے تحت یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اگر اس دنیا میں اپنے عمل اور اعمال سے یہ ثابت کردیں کہ وہ نیک اور اچھے لوگ ہیں تو اس سے شاید ان کی نجات کے بارے میں لوگوں میں یہ تاثر ہوگا کہ خدا ان کے ساتھ ہے، یا اس کی مہربانیاں اور عنایتیں ان کے ساتھ ہیں۔ اس لئے ان لوگوں نے تجارت میں ایمانداری، دیانت اور نیکی کے ساتھ کام کیا، جس کی وجہ سے وہ اس صنعت میں کامیاب رہے، اور ترقی کی۔ لہٰذا اس نظریہ کے تحت میکس ویبر کا کہنا ہے کہ تجارت کی کامیابی میں اخلاقیات کا اہم حصہ رہا ہے اور اس نے سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دیا۔

ایک اور مفکر

ایک اور دانشور ٹینی (Tanny) نے اپنی کتاب ''مذہب اور سرمایہ داری'' (Religion and Capitalism) میں جان کال ون کی مذہبی تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عیسائیوں میں سود لینا حرام ہے۔ لوتھر نے جب اصلاح مذہب کی تحریک چلائی تو اس

نے بھی سود کو حرام قرار دیا۔ لہٰذا سودی کاروبار کے لئے یورپ میں حکومتوں اور چرچ سے خاص طور سے یہودیوں کو یورپ آنے کی دعوت دی تھی تا کہ وہ سود کا کاروبار کریں۔ جان کال ون نے جب چرچ کی اصلاح کی تو اس نے سود کو جائز قرار دیدیا۔ اس کی وجہ سے تجارت میں تاجروں کو آزادی مل گئی کہ وہ بینکوں کے ذریعہ پیسہ لے کر کاروبار میں لگائیں، اس نے یورپ کی تجارت کو بے انتہا فروغ دیا، کیونکہ وہ افراد کہ جن کے پاس سرمایہ نہیں تھا، مگر تجارت میں دلچسپی بھی تھی اور صلاحیت بھی، انہوں نے سود کو قبول کر کے سرمایہ داری کے اُبھار میں حصہ لیا۔

سرمایہ داری کے بارے میں تیسرا نقطۂ نظر، ایک جرمن معیشت داں زومبرٹ (Zombart) کا ہے۔ اس نے سرمایہ داری کے فروغ میں یہودیوں کے کردار کی جانب اشارہ کیا ہے، جب انہیں اسپین سے نکالا گیا تو یہ یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہوئے، وہ ان کی ہجرت اور سرمایہ داری کے مراکز کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ جب یہ لوگ ہالینڈ کے شہر اسٹورپ (Astwerp) میں آئے تو یہ تجارت کا مرکز بن گیا۔ جب یہ یہاں سے ایمسٹڈم گئے تو وہ کاروبار کا مرکز بنا، اور یہاں سے جب یہ لندن گئے تو وہاں سرمایہ داری کو عروج ہوا۔ اس لئے جہاں جہاں یہودی ہجرت کر کے جاتے گئے وہاں کاروباری سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں، اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انہوں نے اس کے فروغ میں حصہ لیا ہے۔

سرمایہ داری کے بارے میں جوزف شم پیٹر (Joseph Schum Peter) نے سرمایہ داری کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی ترقی میں تجارتی مہم جو بھی (Enter Prenur) کا حصہ ہے۔ کیونکہ یہ انٹر پری نیور سرمایہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ان میں منظّم کرنے یا ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت ہوتی تھی، یہ سرمایہ کو بینکوں سے لے کر منیجروں اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کو ملازم رکھ کر نئی توانائی کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے موجود نظام کو چیلنج کرتے ہوئے اس کا خاتمہ کرتے ہیں، اور اس کی جگہ نئی روایات اور اداروں کو پیدا کرتے ہیں۔ اس عمل کو وہ تخلیقی روایت شکنی کا نام دیتا ہے۔ اس کی دلیل کی روشنی میں اگر یورپ اور امریکہ میں ان تجارتی یا سرمایہ داری کے مہم جوؤں کو دیکھیں تو ان میں اینڈریو کارنیگی کا نام نظر آئے گا جو اسکاٹ لینڈ کے ایک مزدور کا بیٹا تھا، نو جوانی میں ہجرت کر کے امریکہ آیا اور یہاں اس نے اپنی ذہانت اور مہم جوئی سے ترقی کی اور فولاد کے کارخانوں کا مالک

بن کر بے انتہا دولت مند ہو گیا۔ اس کی دوسری مثالیں راک فیلر، مورگن، اور دوسرے سرمایہ دار ہیں۔ جو غریب سے دولت مند بنے۔ لہٰذا جوزف شم پیٹر کے نزدیک یورپ اور امریکہ کی سرمایہ داری میں ان لوگوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

سرمایہ داری پر قدامت پرستی کے نقطہء نظر سے فرانسیسی انقلاب پر تاثرات میں ایڈمن برک (Burks) نے تاجروں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ یہ لوگ اپنے منافع اور کاروبار کی خاطر قدیم اداروں اور روایات کو تباہ کرتے ہیں، جب یہ ادارے ٹوٹ جاتے ہیں تو معاشرہ انتشار اور بے یقینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل کے مطابق فرانسیسی انقلاب میں تاجروں کے اس طبقہ نے فرانس کی وہ قدیم روایات کہ جن کی تشکیل میں صدیاں صرف ہوئی تھیں، انہیں ختم کر کے ملک اور معاشرے کو تباہ کر دیا۔ تاجر قدیم ادارے اس لئے توڑتے ہیں کہ یہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن کر آتے ہیں۔ تجارتی سرگرمیوں کے لئے انہیں نئی روایات اور طرز کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ پرانے کی جگہ نئے اداروں کو پیدا کرتے ہیں، مگر برک کے نزدیک یہ معاشرے کے لئے تباہ کن ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر سوسائٹی کو عدم تحفظ کا شکار بنا دیتے ہیں۔

سرمایہ داری پر شم پیٹر کی بھی تنقید ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ مقابلہ ہوتا ہے، اس لئے سرمایہ دار اور صنعت کار مقابلہ کی خاطر ٹیکنالوجی میں روز نئی ایجادات کی سرپرستی کرتا ہے تاکہ اس کی اشیاء دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور کارآمد ہوں۔ لہٰذا اس مقابلہ کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں ایجادات کا ایک سیلاب آ جاتا ہے۔ یعنی ایک چیز کا پوری طرح سے استعمال نہیں ہو پاتا ہے کہ ایک دوسری ایجاد بہتر شکل میں سامنے آ جاتی ہے اور پہلی والی چیز فرسودہ اور بیکار ہو جاتی ہے۔ نیز یہ مسلسل ایجادات اور مقابلہ بازی کی وجہ سے صارف کے لئے مشکل ہوگا کہ وہ اس تیزی سے نئی ایجادات کا ساتھ دے سکے اور ان کے استعمال سے بخوبی واقف ہو سکے۔ یہ ایک مرحلہ پر سرمایہ داری کو ختم کر دے گا۔

اس کا اندازہ ہمیں آج کے دور میں ہو رہا ہے کہ جب کمپیوٹر، سیل فون، اور آئی پیڈ وغیرہ کی جس تیزی سے ایجادات ہو رہی ہیں، اور پرانی چیزیں بیکار ہو رہی ہیں، یہ صارفین کے لئے

ناممکن بنادے گا کہ وہ ہر تین یا چھ مہینے بعد نئی ایجاد شدہ چیز کو خریدیں کیونکہ اس میں مرمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ایک شے جب پرانی ہوگئی تو اسے بیکار کر دیا جاتا ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں رہتی ہے۔

لہٰذا کیا سرمایہ دارانہ نظام اس بحران کا کوئی حل تلاش کرے گا، یا اس مقابلہ بازی میں اس کی شکست ہوگی؟

سائنٹیفک سوشل ازم اور کارل مارکس

یوٹو پیائی سوشلسٹوں کے برخلاف کارل مارکس نے صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کا سائنٹیفک تجزیہ کیا۔ وہ 1818ء میں جرمنی کے شہر ٹرائر (Triar) میں پیدا ہوا، اس کا باپ وکالت کا پیشہ کرتا تھا، اور یہودیوں کے خلاف پابندیوں کی وجہ سے اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ مارکس بھی اس پیشہ کو اپنا وسیلہ روزگار بنائے کیونکہ اس میں معاشی خوش حالی کی ضمانت تھی۔ کارل مارکس نے جب اعلیٰ تعلیم کے لئے بون یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس کی دلچسپی قانون کے برخلاف فلسفہ سے ہوگئی۔ اس نے بعد میں برلن یونیورسٹی میں پڑھا اور ینا (Jenna) سے یونانی فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ اس وقت جرمنی میں ہیگل کے فلسفہ کا بڑا اثر تھا، مارکس نے اس کے فلسفہ کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کئی ہفتوں اپنے کمرے میں بندر ہا اور ہیگل کا مطالعہ کرتا رہا، جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ہی۔ گے۔ لین ہو چکا ہے۔ اس وقت ہیگل کے فلسفہ کے پیروکاروں میں دائیں بازو کے فلسفی تھے، مارکس بائیں بازو کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا، جس کے مشہور فلسفیوں میں فیورباخ (Fever Bagh)، ڈیوڈ اسٹراؤس (David Straus) اور بیونر بائر (Buner Bauer) تھے۔ ان میں فیورباخ اور اسٹراؤس نے عیسائی مذہب کا سیکولر نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا، جس نے عیسائیت کے بارے میں ایک نئے سیکولر نظریہ کو پیدا کیا۔ فیورباخ کی مذہب کے اوپر بھی تنقید ہے، جس نے مارکس کو بے انتہا متاثر کیا تھا۔

لیکن ان لوگوں کو جرمنی کی کسی بھی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے بحیثیت استاد موقع نہیں دیا گیا، کیونکہ ان کے انقلابی خیالات جرمنی کی ریاست پروشیا کے خلاف تھے، اس لئے مارکس نے راہ نش اے سائی ٹنگ میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ اس دوران اس نے جینی سے شادی کی،

جس کا تعلق امراء کے خاندان سے تھا۔ کیونکہ مارکس کے مضامین انتہائی انقلابی تھے، اس لئے پروشیا کی حکومت نے اسے جلاوطن کر دیا۔ مارکس معہ اپنے خاندان کے پیرس چلا آیا۔ یہاں اس نے فرانسیسی تاریخ اور فرانسیسی انقلاب کا مطالعہ کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ انقلاب کی ناکامی یہ تھی کہ انقلابی راہنماؤں نے بورژوا طبقے کی حمایت میں نجی جائیداد کو تحفظ فراہم کر کے انقلاب کو روک دیا اور اس کے عوام کو خارج کر دیا۔

پیرس میں بھی مارکس نے ''یہودی سوال'' (Jevish Quatism) پر لکھا، اس کی تحریر کے مطابق یہودیوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ خود پسند، خودغرض، اور پیسہ کی پوجا کرنے والے ہیں، اس کی دلیل کے مطابق یہ اوصاف سرمایہ دارانہ نظام میں ہر فرد کے ہوتے ہیں۔ اس لئے صرف یہودیوں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے۔

پیرس میں رہتے ہوئے مارکس کے خیالات کی تشکیل میں تین عناصر نے حصہ لیا۔ فرانس کے مفکروں اور دانشوروں کے سیاسی خیالات، جرمنی کے فلسفیوں کے فلسفہ اور تاریخ کے افکار، اور انگلستان کے معیشت دانوں کے نظریات، لہٰذا جب اس کی پیرس میں اینگلز سے ملاقات ہوئی تو دونوں نے مل کر جرمن آئیڈیالوجی (German Ideology) لکھی۔ اس کی یہ کتاب ناشروں نے شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی، کیونکہ ان کے خیال میں اس کی مارکیٹ نہیں تھی، اور شاید ان کے مطابق اس کے قارئین زیادہ تعداد میں نہیں تھے۔

پروشیا کی حکومت نے یہاں بھی مارکس کو چین سے نہیں رہنے دیا اور فرانس کی حکومت سے درخواست کی کہ اسے وہاں سے نکال دیا جائے۔ مارکس پیرس سے بلجیم چلا آیا۔ یہاں کمیونسٹ لیگ نے اس سے کہا کہ وہ پارٹی کا مینی فسٹو لکھے۔ لہٰذا یہ مینی فسٹو اس نے اور اینگلز نے مل کر لکھا۔ اس میں مارکس نے تاریخی طور پر فیوڈل ازم اور سرمایہ داری کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کی زبان میں جوش و جذبہ ہے جو دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس نے بورژوا طبقہ کی اس لحاظ سے تعریف کی ہے کہ اس نے دنیا کو بدل ڈالا ہے، سرحدوں کو توڑ دیا ہے، پرانے ادارے اور روایت کا خاتمہ کر دیا ہے، ایک نئی دنیا پیدا کی ہے۔ لیکن اس دنیا میں افراد کے باہمی رشتوں کا تعلق پیسہ سے ہے۔ (Cash nerus) اس لئے وہ اس نظام کو بدل کر سوشل ازم اور کمیونزم کی بات کرتا ہے کہ جس میں فرد کو آزادی ہو گی اور انسانی رشتے پیسوں کی قید سے آزاد ہوں گے۔

بلجیم سے وہ انگلستان چلا آیا، جہاں وہ اپنی وفات تک مقیم رہا۔ انگلستان میں اس نے اپنی زندگی انتہائی مفلسی اور غربت کی حالت میں گذاری، یہ غربت اور اس زندگی کا انتخاب اس نے خود آزادی کے ساتھ اختیار کیا تا کہ جن لوگوں کے لئے وہ لکھ رہا تھا، اس زندگی کا اسے تجربہ ہو۔ اس غربت میں اس کی بیوی نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی مالی ضروریات کو اینگلز نے پورا کیا، یا اس نے امریکہ کے اخبار میں مضامین لکھ کر کچھ پیسے حاصل کئے۔

لندن میں رہ کر اس نے اپنا تمام وقت مطالعہ کرنے اور لکھنے میں صرف کیا۔ اس کے مطالعہ کا نتیجہ داس کیپٹل ہے، جس میں اس نے سرمایہ داری کے بارے میں اپنے نظریات کو پیش کیا ہے۔

مارکس نے تاریخ کا جو نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق میں تاریخ کو کئی ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ ابتدائی انسانی تہذیب کو وہ ابتدائی کمیونزم کہتا ہے جو دور غلامی، فیوڈل ازم، اور پھر سرمایہ داری میں ارتقاء پذیر ہو کر آتا ہے۔ سرمایہ داروں کے بعد وہ کمیونزم کی پیش گوئی کرتا ہے کہ جو انسانی تہذیب کا آخری دور ہوگا کیونکہ اس میں طبقاتی کش مکش اور تضادات ختم ہو جائیں گے۔

شکار اور غذا جمع کرنے کے عہد اور اس سے پہلے انسان کے ارتقاء کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اگرچہ انسان کا ارتقاء حیوانوں سے ہوا ہے، مگر اس میں اور دوسرے حیوانوں میں فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرے حیوان ایک ہی قسم کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، پرندے اگر گھونسلہ بناتے ہیں تو وہ ہمیشہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن انسان میں تخلیقی صلاحیت ہے وہ ماحول کے مطابق بدلتا رہتا ہے، مثلاً شکار اور غذا جمع کرنے کے دوران اس نے پتھر کے اوزار اور ہتھیار بنائے۔ بعد میں انہیں تبدیل کر کے کانسی اور لوہے کے ہتھیار بنانے لگا۔ اس کی اس تخلیقی صلاحیت نے اسے دوسرے حیوانوں سے ممیّز کر دیا ہے۔

اس لئے مارکس ذرائع پیداوار، یعنی اوزار، آلات، اور ہتھیار اور نظام پیداوار کے درمیان رشتہ دیکھتا ہے۔ اس کے مطابق جب ذرائع پیداوار تبدیل ہوتے ہیں، تو اس کے دباؤ کی وجہ سے نظام پیداوار بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً غلامی کے دور میں، غلام پیداوار کا ایک ذریعہ تھا، لیکن جب غلامی معاشی طور پر بوجھ بن گئی اور اس کا خاتمہ ہوا، تو فیوڈل نظام کی جگہ جس میں فیوڈل اور سرف (Serf) کے طبقے پیدا ہوئے۔ جب ذرائع پیداوار کے لئے مشینیں آئیں، صنعتی انقلاب

آیا تو اس کے نتیجہ میں مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا، اور نظام سرمایہ داری پیدا ہوا۔ اس کی اس تشریح کے بعد وہ کہتا ہے کہ نظام پیداوار، ہر دور میں اپنا کلچر پیدا کرتا ہے۔ جس میں ادب، آرٹ، موسیقی، سیاست اور معیشت وغیرہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اگر فٹ بال کے کھیل کو دیکھیں تو اس میں اس کی جھلک نظر آئے گی۔ مثلاً تقسیم کار کی طرح اس میں بھی ہر کھلاڑی کے کھیلنے کا مقام ہوتا ہے۔ ٹیم کا منیجر فیکٹری کے نگران کی طرح، کھلاڑیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ٹیم کا مالک ہوتا ہے جو ٹیم کی تربیت اور کھیلنے میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے، اس سے پورے سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک ملتی ہے۔

مارکس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہر نظام کے اندر، آنے والے نظام کے جراثیم ہوتے ہیں۔ جب دور غلامی میں فیوڈل ازم کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے اور فیوڈل ازم میں سرمایہ دار کے نشانات نظر آنے لگے تھے۔

مارکس جب سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتا ہے تو اس کا کہنا ہے کہ اس میں اول تو انسانی رشتے ختم ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ پیسہ یا سرمایہ لے لیتا ہے۔ دوسرے اس نظام میں طمع اور لالچ کا عنصر ہے جو اسے ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا ہے، بلکہ پھیلاؤ پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے، جہاں تک مزدور کی حیثیت ہے تو اس کے پاس اپنی محنت کے علاوہ فروخت کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ سرمایہ دار اس کو سستے داموں خریدتا ہے جب 8 9 گھنٹے کام کرتا ہے، تو وہ اس کی صرف ایک یا دو گھنٹہ محنت کا معاوضہ دیتا ہے، باقی محنت وہ ہتھیا لیتا ہے۔ یہ زائد مقدار یا(Surpluss Value) کا نظریہ ہے۔ جو سرمایہ دار کے استحصال کو ظاہر کرتا ہے۔ مزدور اس لئے سرمایہ دار کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ ذرائع پیداوار کا وہ مالک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی شرائط پر مزدور سے محنت کراتا ہے۔

مارکس کا یہ بھی کہنا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور اپنی تخلیق سے محروم ہو کر اس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ اس سے چھین لیا جاتا ہے، وہ سرمایہ دار کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس سے اس نے بیگانگی کے نظریہ کا تصور پیش کیا۔

لہٰذا مارکس کا کہنا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں بڑے کارخانے یا کارپوریشنیں مسلسل اپنی صنعت کو پھیلائیں گی اور اس کے نتیجہ میں چھوٹے صنعت کار یا کارخانے ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، اور سرمایہ چند بڑے صنعت کاروں میں مرتکز ہو جائے گا اس کے نتیجہ میں پرولتاری یا مزدور

طبقے میں اضافہ ہوگا اور بالآخر یہ طبقہ سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت کر کے انقلاب لائے گا اور اس استحصال کا خاتمہ کر دے گا۔

اس کے بعد مارکس نے جو نقشہ یا تصور پیش کیا ہے وہ یوٹوپیائی ہے کہ جب معاشرے پر طبقاتی تضادات ختم ہو جائیں گے تو نہ تو ریاست کے ادارے کی ضرورت رہے گی اور نہ کسی ایک طبقے کی بالادستی ہوگی۔ ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسان محنت سے ترقی کرے گا۔ فرصت کے لمحات میسر ہوں گے جن میں وہ موسیقی سے لطف اندوز ہوگا، ادب اور فلسفہ پڑھے گا اور ذہنی طور پر ترقی کرے گا۔

مارکس کے نظریات و افکار نے دنیا کو متاثر کیا، مجبور، بے بس اور استحصال شدہ لوگوں کو امید کا پیغام دیا۔ اس کے نتیجہ میں روس، چین، کیوبا میں انقلابات آئے، یہ انقلابات ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے اور آخر میں ناکام بھی۔

مارکس انقلاب کے ذریعہ تبدیلی کا حامی تھا، جب کہ اس کے اپنے زمانے میں، اس کے ساتھیوں نے اس سے ہٹ کر علیحدہ راہ نکالی۔ مثلاً جرمنی میں لیب کنیخت (Leeb Kneth) اور بے بل (Bebel) نے، سوشلسٹ ورکرز پارٹی قائم کی، اور انقلاب کی جگہ پارلیمانی انتخاب کے ذریعہ پارلیمنٹ میں جا کر قوانین کے ذریعہ سماجی تبدیلی کی بات کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک انتخابات کے ذریعہ لوگوں کو باشعور بنا کر الیکشن میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور یوں انقلاب کے بغیر تبدیلی کے امکانات ہیں۔

مارکس نے دوسرے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی 1857ء پر اس کے مضامین ہندوستان کی سیاست پر فکر انگیز ہیں۔ مارکس نے خیالات اور نظریات سے علمی دنیا کو متاثر کیا ہے۔ آج تاریخ، فلسفہ، علم بشریات، سیاسیات اور معیشت کا کوئی علم ہو۔ اس میں مارکس کے نظریات نے ایک نئی سوچ پیدا کی ہے۔ لہٰذا اگر عملی سیاست میں مارکسی انقلابات ناکام ہوئے، مگر نئی دنیا میں وہ اب تک زندہ ہیں اور ان کی مدد سے معاشرے کے مسائل کو سمجھا جا سکتا ہے۔

مارکس کی وفات 1882ء میں ہوئی، وہ لندن میں ہائی گیٹ کے قبرستان میں دفن ہے جہاں آج بھی روزانہ سیاحوں کی ایک بڑی تعداد اس کی قبر کی زیارت کرنے آتے ہیں۔ اس قبرستان میں اس کی واحد قبر ہے کہ جہاں ہمیشہ تازہ پھولوں کے گلدستے رکھے رہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ابھی تک اسے بھولے نہیں ہیں۔

ذہین لوگ کہاں گئے؟

یورپ میں بادشاہت کے نظام کے دوران امراء کا طبقہ ریاست کے تمام شعبوں پر پوری طرح سے حاوی تھا، یہ لوگ سیاسی عہدوں پر فائز ہوتے تھے،فوج کے اندر اعلیٰ عہدے ان ہی کے لئے تھے، چرچ میں بھی اونچے عہدوں پر ان ہی کا تقرر ہوتا تھا۔ لہٰذا خاندان در خاندان مراعات سے فائدہ اُٹھاتے تھے،اور اس تمام سلسلہ میں عام لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی کیونکہ تقرر کی وجہ خاندان تھا، ذہانت نہیں تھی۔ چاہے یہ ذہنی طور پر اوسط درجہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں، اپنے خاندانی رشتوں اور تعلقات کی وجہ سے ریاست کے تمام عہدے ان کے لئے تھے۔

اس فرق کو ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں کہ جب امریکہ آزاد ہوتا ہے تو چونکہ اس کے معاشرے میں کوئی امراء کا طبقہ نہیں تھا، اس لئے ان لوگوں کے لئے جو ذہین، محنتی اور لائق تھے، کامیابی کے تمام مواقع موجود تھے۔ یورپ سے بھی جو غریب اور مزدور یا کسان طبقوں سے لوگ امریکہ ہجرت کر کے گئے، انہیں وہاں کام کرنے اور اپنی ذہانت کو استعمال کرنے کے پورے مواقع ملے، مثلاً اینڈریو کارنیگی، ایک کاریگر کا لڑکا تھا، جو اسکاٹ لینڈ سے امریکہ گیا، اگر یہ وہیں رہتا تو اپنے باپ کے پیشہ کو اختیار کر کے زندگی گزار دیتا، مگر امریکہ میں اس کو اپنی ذہانت اور محنت دکھانے کے مواقع ملے، اور یہ وہاں کا بڑا سرمایہ دار اور صنعت کار بن گیا۔ اس نے خاص طور سے اپنے سرمایہ کو لوگوں کے فائدے کے لئے استعمال کیا اور شہروں میں جگہ جگہ کتب خانے قائم کئے۔ کارنیگی کی طرح کے اور بہت سے افراد تھے کہ جنہوں نے خاندان کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کر کے نام پیدا کیا، یہ لوگ سیاست میں بھی آئے، اور ان میں اکثر غریب خاندان کے لڑکے ملک کے صدر بنے اور اعلیٰ عہدوں پر رہے۔

پاکستان کے ابتدائی دنوں میں چونکہ یہاں ہر طبقے کے لوگوں کے لئے تعلیم کی سہولتیں تھیں،

اس لئے پبلک اسکولوں میں امیر وغریب دونوں کے بچے پڑھتے تھے، اور یہ تعلیم یونیورسٹی تک اسی طرح سے بغیر کسی فرق کے تھی، اس لئے ذہین طالب علموں کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہو جائیں، یا دوسری ملازمتوں کے مقابلہ میں اپنی ذہانت کی بنیاد پر کامیابی حاصل کریں۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نظام میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ دولت منداور امراء کا طبقہ اپنے اثر ورسوخ کو بڑھاتا چلا گیا، انہوں نے اپنے بچوں کے لئے پرائیویٹ اسکولوں کی ابتداء کردی جو بڑھتے بڑھتے اس قدر مہنگے ہوئے کہ اس میں عام لوگوں کے بچوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی پبلک اسکولوں کا معیار گرتا چلا گیا، اور سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ غریب لوگوں کے بچوں کے لئے تعلیم کے بعد آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ یہاں بھی مواقع ان کے لئے ہیں کہ جن کے پاس سرمایہ ہے، جو اس سے محروم ہیں، چاہے وہ کتنے ہی لائق، اور محنتی کیوں نہ ہوں، ان کے لئے معاشرے میں کوئی عزت اور وقار کی جگہ نہیں رہی ہے۔

مراعات سے محروم طبقوں کے لئے زندگی میں اگر کچھ حاصل کرنا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذہانت کی جگہ خوشامد سے کام لیں، اور طبقہ اعلیٰ کے لوگوں کی چاپلوسی کر کے ان سے جو بچ جائے وہ حاصل کرلیں۔

اس کی مثال پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان جماعتوں کے سربراہ یا تو بڑے جاگیردار ہیں یا سرمایہ دار، انہیں بنیادوں پر ان کو سربراہی ملی ہوئی ہے، اس لئے نہیں کہ ان میں کوئی اہلیت یا صلاحیت ہے۔ اب اگر ان کی پارٹی میں باصلاحیت لوگ ہیں، تو پارٹی میں آگے بڑھنے اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سربراہ کی خوشامد میں مصروف رہیں، کیونکہ جب یہ اقتدار میں آتے ہیں تو ان ہی افراد کی سرپرستی کرتے ہیں، جو ان کے مصاحب ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کسی فرد میں کس قدر لیاقت ہے اور وہ پارٹی کے لئے یا اقتدار میں آنے کے بعد ملک وقوم کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی کسی فرد سے ان کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے، یا وہ اپنی رائے کو آزادی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اسے یا تو پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے یا اسے تمام سرگرمیوں سے علیحدہ کر کے خاموش کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا اب پاکستان میں عہد وسطٰی کے امراء اور طبقہ اعلیٰ کی جگہ جاگیردار اور سرمایہ دار خاندان غالب آ گئے ہیں، اور ان کے خاندانوں کی حاکمیت مستحکم ہو گئی ہے۔ اس پورے سلسلہ میں معاشرے کے ذہین افراد کو جن کا تعلق عوام یا نچلے طبقوں سے ہے ان کو محروم کر کے ان کی ذہانت کو ختم کر دیا گیا ہے۔

سیاسی خاندانوں کے اس تسلط کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وہ افراد بھی کہ جو اپنی محنت اور صلاحیت سے اپنی ذہانت کو تسلیم کرا چکے ہیں، جب انہیں معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ملتی تو وہ یا تو خاموش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں، یا ملک سے ہجرت کر کے نئے مواقعوں کی تلاش میں باہر چلے جاتے ہیں۔

ذہین افراد اس کمی کے باعث ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں نالائق اور اوسط ذہن کے لوگ آگے آ گئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں زوال اور پس ماندگی کے آثار پوری طرح سے ظاہر ہو رہے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ ایک طرف تو امریکہ اور یورپ کے ملک باصلاحیت اور ماہرین کی تلاش میں ملک ملک گھومتے ہیں، مگر ہمارے ہاں باصلاحیت لوگ اپنے ہی حکمرانوں کے ہاتھوں محرومی کا شکار ہو رہے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب ذہانت کو نظرانداز کیا جائے گا تو ایسا معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکے گا، یورپ میں جمہوری روایات نے امراء کے خاندان کے تسلط کو توڑا، اور ذہین لوگوں کے لئے راہ ہموار کی ہمارے ہاں بھی اس کی ضرورت ہے، مگر اس کام کو کون کرے گا؟

پروگریس

پروگریس یا ترقی کا نظریہ یورپ میں اٹھارہویں صدی میں اُبھرا۔ اس نظریہ کے تحت اہل یورپ کا یہ خیال تھا کہ ان کی تہذیب بغیر کسی رکاوٹ کے برابر آگے کی جانب جارہی ہے، اور روز بروز ترقی کی منازل طے کررہی ہے۔ اس نظریہ کے پس منظر میں دو عناصر کام کررہے تھے، اول اہل یورپ کے وہ تاثرات کہ جب پندرہویں صدی میں انہوں نے امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور دور دراز سمندروں میں واقع چھوٹے چھوٹے جزیروں تک رسائی کی اور وہاں کے لوگوں کی زندگی، رسم ورواج اور ان کے کلچر کا مطالعہ کیا، اس کے نتیجہ میں جب انہوں نے یورپ کا مقابلہ کیا تو ان پر یہ واضح ہوا کہ ان کے مقابلہ میں یورپ تہذیبی طور پر زیادہ ترقی یافتہ براعظم ہے، اس مطالعہ نے انہیں یہ بھی موقع دیا کہ وہ انسانی تہذیب کے مختلف مراحل کا تجزیہ کریں، اور یہ اندازہ لگائیں کہ ان کی تہذیب بھی مرحلہ وار ترقی کی جانب آگے بڑھی ہے، لہٰذا انہوں نے تہذیب کی ابتداء، اس کی نشو ونما، اور اس کی پختگی کے مراحل کا مطالعہ کرتے ہوئے تہذیب کی ترقی کے معیار کا تعین کیا۔

یہاں اس کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جب انہوں نے چین اور ہندوستان کی تہذیبوں کا مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ماضی میں یہ تہذیبیں ترقی یافتہ تھیں، مگر آہستہ آہستہ تباہ ہو کر یہ پس ماندہ ہوگئی ہیں، لہٰذا ان قدیم اور امریکہ یا آسٹریلیا کی رکی ہوئی تہذیبوں کے مقابلہ میں مغربی تہذیب جاندار، توانا، اور ترقی کے جذبات پر برابر آگے کی جانب بڑھ رہی ہے۔

پروگریس کے اس تصور کے ساتھ ہی سترہویں صدی میں یورپ میں جو سائنسی انقلاب آیا، اور اس کے بعد روشن خیالی کی جو تحریک چلی، اس نے یورپ کے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ ٹیکنالوجی نے نہ صرف پیداوار کو بڑھایا، بلکہ انسان کی محنت کی جگہ لینا شروع کی۔ اس کے

بعد دو انقلابوں نے یورپ کے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا، صنعتی انقلاب کہ جس نے سائنس، ٹیکنالوجی میں اضافے کئے، نظام سرمایہ داری کو پیدا کیا، پیداوار میں اضافہ کیا، مگر ساتھ ہی میں معاشرے میں غیر مساویانہ سماجی نظام کو بھی اُبھارا، مگر صنعتی انقلاب نے منڈیوں کی تلاش میں یورپ کو ایشیا وافریقہ، اور لاطینی امریکہ کو اپنی نوآبادیات بنالیا، اور وہاں سے خام مال لے کر اپنی صنعتوں کو فروغ دیا۔

دوسری جانب 1789ء میں فرانسیسی انقلاب نے سیاسی اور سماجی طور پر یورپ میں ایک نئے معاشرے کی تشکیل کی، جس میں مساوات، آزادی اور اخوت کا پرچار تھا، یورپ کے معاشرے میں ان تہذیبوں کی وجہ سے فلسفیانہ خیالات ونظریات ابھرے جن میں قوم پرستی، لبرل ازم، قدامت پرستی، سوشل ازم، اور حقوق نسواں کے اہم نظریات تھے۔ ان معاشی اور سیاسی و سماجی نظریات کی بنیاد پر یورپ کے معاشرے میں جو ترقی ہوئی، اس نے اہل یورپ میں اس تصور کو پیدا کیا کہ ان کی تہذیب سب سے برتر اور اعلیٰ ہے، اس لئے ان کا حق ہے کہ وہ دنیا پر حکومت کریں اور جو اس تہذیب سے باہر ہیں، انہیں مہذب بنا کر انہیں ترقی میں شامل کریں۔

لیکن پروگریس کے اس نظریہ پر کچھ مفکرین نے سخت تنقید کی، ان میں فرانس کا مشہور مفکر روسو تھا، جس کی دلیل تھی کہ تہذیب کی اس ترقی نے انسان سے اس کی خوشی ومسرت کو چھین لیا ہے، قدیم زمانہ میں جب وہ جنگلوں میں آزاد تھا، اس وقت مرد وعورت کو برابر کا درجہ تھا، نجی جائیداد کا کوئی تصور نہیں تھا، ہر شخص اپنا کام خود کرتا تھا، محنت کی تقسیم سے لوگ واقف نہیں تھے۔ اس لئے انسانی فطرت میں حسد، رشک، غصہ اور دوسروں سے نفرت کے جذبات نہیں تھے۔ مگر جیسے ہی انسان نے تہذیب کی ابتداء کی، اس کے ساتھ ہی تہذیب اپنے ساتھ یہ مسائل لے کر آئی، اور انسان ان زنجیروں میں گرفتار ہو کر اپنی آزادی کو کھوتا رہا۔ لہٰذا روسو تہذیب کی ترقی کا نقاد ہے۔ وہ یہ تو نہیں کہتا کہ ہمیں واپس ماضی میں چلے جانا چاہئے کیونکہ یہ تو ناممکن ہے، مگر ہم تہذیب کے ان مسائل کو جنہوں نے فرد کی آزادی، اور اس کی توانائی کو ختم کر دیا ہے، اس کو درست کر سکتے ہیں، اپنی کتاب معاہدہ عمرانی میں اس نے ایک نئے سیاسی نظام کا خاکہ پیش کیا ہے۔

لیکن روسو اور دوسرے مفکرین کی تنقید کے باوجود یورپ میں ترقی کا پہیہ رکے بغیر چلتا رہا، یہاں تک کہ برطانیہ نے ایشیا وافریقہ کے ملکوں پر قبضہ کر کے استعمار کی بنیادوں کو مضبوط

کیا۔اس کے مقابلہ میں فرانس نے بھی اپنی نوآبادیات کو بڑھایا، اور پھر ہالینڈ، بلجیم اور آخر میں جرمنی بھی اس دوڑ میں شریک ہوگئے، اور اب محسوس ہونے لگا کہ مغربی تہذیب دنیا پر چھا جائے گی اور دوسری تہذیبوں کو ختم کر دے گی۔اس کا اظہار یورپ کے سماجی علوم، اور ادبی شاہ پاروں میں ہورہا تھا۔

مگر اس کے ساتھ ہی یورپی ملکوں میں معاشی اور سیاسی طور پر رقابت بڑھ رہی تھی۔ ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔اس نے 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کی ابتداء کی۔ جس میں لاکھوں انسان مارے گئے، ٹیکنالوجی کو ہلاکت اور تباہی کے لئے استعمال کیا گیا۔

نیشنل ازم اور حب الوطنی کے نام پر اپنے ہی لوگوں کو قربان کیا گیا۔لہٰذا اس جنگ نے یورپ کے لوگوں کو شدید صدمہ سے دوچار کیا، اور پروگریس یا ترقی جواب تک ان کے خیال میں بغیر رکاوٹ کے بڑھ رہی تھی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس نے یورپ کی تہذیبی برتری کو چیلنج کیا، اور اس کے بعد ہی یورپ کی نوآبادیات میں آزادی کی تحریکیں چلیں، جنہوں نے بالآخر یورپ کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔اس کے ساتھ ہی پروگریس کا نظریہ بھی اپنا کردار ادا کر کے ختم ہوگیا۔

تبدیلی کون لائے گا؟

عیسائیوں میں ایک فرقہ ہے جو اپنے بدن کو اذیت دیتا ہے، کوڑے مارتا ہے، اور اسے لہولہان کرتا ہے، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی بدن برائیوں کی جانب مائل کرتا ہے اور انسان کو دنیاوی برائیوں اور جھگڑوں میں اُلجھاتا ہے۔ بدن کو تکلیف پہنچا کر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کی آلائشوں سے دور رہیں گے۔ اسی طرح سے کچھ نفسیاتی مریض اپنے جسم کو اذیت دے کر، مسرت حاصل کرتے ہیں، اس قسم کی صورت حال سے ہم اس وقت دوچار ہوتے ہیں کہ جب ہمارے متوسط طبقہ کے دانش ور اور غور وفکر کرنے والے لوگ جب اپنے ڈرائنگ روموں میں جمع ہوتے ہیں تو ان کا موضوع ہماری سوسائٹی اور اس کی خرابیاں ہوتی ہیں، ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی اور اس کے مسائل کے بارے میں کس قدر آگہی رکھتے ہیں۔ اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ دراصل ہماری سوسائٹی اور اس کے لوگوں میں جینیٹک خرابی ہے، اس کو عیسائیوں کی زبان میں اوریجنل گناہ بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ خرابی بنیادی طور پر پیدائشی ہے، جب کہ کوئی معذور پیدا ہوتا ہے، اور اس کی یہ معذوری دور نہیں کی جا سکتی ہے، اسی طرح سے ہماری سوسائٹی کی اصلاح نہیں کی جا سکتی ہے یہ اسی طرح سے ہے اور رہے گی۔

اس کے بعد لوگ اپنے اپنے تجربات بیان کرتے ہیں، جن میں سرفہرست معاشرے کی بدعنوانیاں ہیں۔ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا ہے، حتیٰ کہ بڑے بڑے افسر بھی اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ رشوت کے ذریعہ اپنے کام کرائیں، جیسا کہ ایوب خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک بار کہا کہ ملک کا صدر ہوتے ہوئے بھی وہ پٹواری کو رشوت دینے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد سفارش کا سوال آتا ہے، ہر شخص اس پر بحث کرتا ہے کہ سفارش کی وجہ سے لائق اور ذہین لوگ آگے نہیں آتے ہیں، اور نااہل ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

جب شکایتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو محفل میں شریک ہر فرد اس میں حصہ لینے کے لئے بے چین نظر آتا ہے، اور ٹریفک کی مشکلات سے لے کر، ملازمین کی بے ایمانی کی داستانیں بڑے جوش اور ولولہ سے سنائی جاتی ہیں، جب یہ حضرات معاشرے کو جسمانی اذیت دینے میں مصروف ہوتے ہیں، تو ہر شخص کو اندرونی طور پر بڑی مسرت ہوتی ہے بلکہ اگر کسی کا انداز بیان خوبصورت ہو، اور وہ معاشرے کا بہترین طریقہ سے پوسٹ مارٹم کر رہا ہو، تو لوگ واہ واہ اور سبحان اللہ بھی کہتے ہیں۔

اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان طویل بحثوں، اور تجزیوں کے بعد جب محفل برخواست ہوتی ہے تو یہ حضرات بڑے اطمینان سے جا کر سو جاتے ہیں، اور دوسرے دن جب اٹھتے ہیں تو معاشرے کی ان ہی برائیوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے یہ رشوت سے بھی کام چلاتے ہیں، سفارش کو بھی اختیار کرتے ہیں، اور اپنے نااہل رشتہ داروں کو ملازمتیں دلانے کی کوششیں بھی کرتے ہیں۔

کارل مارکس نے فلسفیوں کے بارے میں کہا تھا، کہ انہوں نے اپنے فلسفہ کے ذریعہ دنیا کی تاویل اور تعبیر تو کر دی، اب وقت ہے کہ اس دنیا کو تبدیل کیا جائے یہی بات پاکستان کے متوسط طبقہ کے دانشوروں، اور پیشہ ور ماہرین کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے معاشرے کی بدعنوانیوں، برائیوں، اور خرابیوں کو سمجھ لیا ہے، اور یہ اندازہ بھی کر لیا ہے کہ ان کی وجہ سے معاشرہ انتشار اور بے یقینی کا شکار ہے مگر اب باتوں کے بجائے عمل کا وقت ہے، اور معاشرے کو تبدیل کرنے کا کام ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر متوسط طبقہ کے لوگ، جو کہ معاشرے کا باشعور طبقہ ہے، کیوں تبدیلی کے عمل سے دور ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کی برائیوں اور بدعنوانیوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے، اور اس سمجھوتہ کے بعد ان کے لئے یہ بدعنوانیاں مشکلات کا باعث نہیں رہیں اس لئے جب بغیر تبدیلی کے ان کی زندگی آرام سے گذر رہی ہے تو پھر تبدیلی کی کیا ضرورت ہے؟

کیونکہ تبدیلی بھی ایک متبادل نظام چاہتی ہے، ایسا نظام جو موجودہ خرابیوں کو دور کر کے عوام کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے، ایک متبادل نظام قائم کرنے اور پرانے نظام کو توڑنے کے لئے جدوجہد اور تخلیقی ذہن کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ایک مشکل کام ہے، اور ہمارا متوسط طبقہ اس سے دور رہنا چاہتا ہے، کیونکہ نہ تو اس میں تخلیقی ذہن ہے نہ تبدیلی کی خواہش، اور نہ نئی دنیا

بنانے کا حوصلہ اور توانائی۔

اس لئے یا تو سمجھوتہ پر عمل کیا جاتا ہے، یا پھر بے بسی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ چونکہ معاشرے کی خرابیاں پیدائشی طور پر ہیں، اس لئے انہیں دور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی بھی معاشرہ اس صورت حال سے گزرتا ہے تو اس کے حکمراں طبقوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھے گی، اور معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جو ان کی مراعات کو چیلنج کرے۔

رہے عوام تو وہ بے سہارا ہو کر خود کو حالات کے سپرد کر دیتے ہیں، اور اس امید پر زندگی گزار دیتے ہیں کہ کوئی آئے گا اور ان کی مصیبتوں کا مداوا کرے گا۔ امید کا یہ جذبہ انہیں سہارا دیتا ہے کہ وہ ہر ظلم و ستم اور اذیت کو برداشت کریں، اور غربت و مفلسی کی زندگی گزارتے رہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا متوسط طبقہ، اس کے دانشور اور ماہرین اس کو محسوس کریں کہ تبدیلی کے ذریعہ ہمارے معاشرے کو بدل سکتے ہیں، اور تبدیلی لانے میں ان کا شعور اور آگہی، اہم کردار ادا کرے گا؟

ادارے اور افراد

تاریخ میں ریاست کے قیام کے بعد اس کے ادارے تشکیل پائے، یہ ادارے وقت کی ضرورت کے تحت وجود میں آئے۔ جیسے جیسے یہ ادارے مضبوط اور مستحکم ہوئے، اور ان میں پیشہ ور افراد آئے، اس کی وجہ سے ملک میں سیاسی استحکام ہوا، جب ادارے باعمل ہوئے تو ان کی وجہ سے صاحب اقتدار افراد کی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ اگر اقتدار میں ذہین افراد کی جگہ اوسط ذہن کے لوگ بھی آ جائیں تو ادارے ریاست کو چلاتے رہتے ہیں۔ اگر چہ صاحب اقتدار ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اداروں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ لیکن جب اداروں میں ذہین، لائق اور قابل لوگ ہوں تو وہ ان کے عمل دخل کو زیادہ نہیں ہونے دیتے ہیں۔ لیکن جب ادارے کمزور ہو جائیں، اور ان میں غیر تربیت یافتہ اور نااہل لوگ آ جائیں تو اس صورت میں ادارے صاحب اقتدار افراد کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں، اور ریاست کے بجائے ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

تاریخ میں اداروں کے کردار کے بارے میں کافی مواد موجود ہے مثلاً اکبر نے مغل سلطنت کی تشکیل کی اور اداروں کو بنانے میں سرگرم حصہ لیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر کی وفات کے بعد اورنگ زیب تک، اس کے جانشینوں نے آرام سے حکومت کی، کیونکہ ریاست کے ادارے اپنی جگہ اہم اور ریاست کے مفادات کو پورا کر رہے تھے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہاں ہم افراد کو زیادہ اہم پاتے ہیں۔ ملک کے وجود میں آنے کے بعد بجائے اس کے کہ اداروں کو مضبوط کیا جاتا، ساری ذمہ داری افراد پر ڈال دی گئی، اور یہ توقع کی گئی کہ وہ ملک اور معاشرے کے مسائل کو سلجھائیں گے۔ مثلاً اب تک یہ بات کہی جاتی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح ملک کی

تقسیم کے فوراً بعد وفات پا گئے، اگر وہ اور زندہ رہتے تو ملک کی یہ حالت نہیں ہوتی، کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا کہ اگر ابتداء ہی سے ریاست کے اداروں کو وسیع بنیادوں پر تشکیل دیدیا جاتا تو یہ ادارے ریاست کو مضبوط کرتے اور ملک میں جو بحران آئے ان پر قابو پایا جاسکتا تھا۔

پاکستان کی تاریخ میں ابتداء ہی سے اداروں سے زیادہ افراد کو اہمیت دی گئی یا یوں کہہ لیجئے کہ صاحب اقتدار افراد نے اداروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے اپنی طاقت اور اقتدار کو طویل کرنے اور مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً پاکستان کے ابتدائی سالوں میں گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑا، اور ان کے اس فیصلہ کو سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دیدیا۔ انہوں نے اپنے ذاتی اختلافات کی بنیاد پر خواجہ ناظم الدین کو وزیراعظم کے عہدے سے ہٹایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداء ہی میں جن اداروں کو مضبوط ہونا تھا وہ کمزور ہو کر حکمراں سلسلہ کو ختم کریں گے تو ایوب خاں نے مارشل لاء لگا کر اپنے اقتدار کے لئے بنیادی جمہوریت کا نظام نافذ کیا۔ جب بنگلہ دیش کا بحران ختم ہوا، اور پی پی کی حکومت اقتدار میں آئی تو بھٹو نے ریاستی اداروں کو اپنی پارٹی کا حصہ بنا کر اپنے سیاسی اقتدار کے لئے استعمال کیا، اور یہ سلسلہ ضیاء الحق، اور مشرف کے دور میں بھی جاری رہا۔

جب ادارے اپنی اہمیت، اور اپنی قوت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو کھودیں، تو اس صورت میں وہ اپنی بقاء کے لئے خوشامد اور سازش کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ادارے کمزور ہوئے اور افراد طاقت ور ہوئے تو اس نے ذہین اور لائق افراد کی ترقی اور آگے بڑھنے کے مواقع ختم کردیئے، کیونکہ جب ترقی فرد کی مرضی اور اس کے اختیارات پر ہو تو پھر خوشامد اور سازش کے ذریعہ ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں پر ایک فرد کا قبضہ ہے جو جماعت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پارٹی کے ارکان عام طور سے خوشامد میں اس طاقت ور اور بااثر شخص کو اپنی پارٹی کا تاحیات صدر بنانے پر اصرار کرتے ہیں، جب ملک کے مسائل پر فیصلہ کا سوال آتا ہے تو پارٹی کے ارکان متفقہ طور پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ حتمی فیصلہ کا حق ان کے صدر کو ہے۔ بحث ومباحثہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی جاتی ہے لہٰذا اسی سے خاندانی سیاست اُبھرتی ہے، جو پارٹی کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، اور جب یہ اقتدار میں آتے ہیں تو یہ اداروں کو اپنے

زیرنگیں لاکرانہیں استعمال کرتے ہیں، اس وجہ سے چاہے وہ بیوروکریسی ہو، یا پولیس یا دوسرے ادارے یہ سب بااقتدار افراد کی تعریف وتوصیف میں مصروف رہتے ہیں۔

حکمراں افراد اپنی قوت وطاقت، اور اقتدار کے لئے یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ نئے ادارے قائم کئے جائیں۔لیکن اگر اداروں میں پیشہ ورانہ ماہرین کی جگہ خوشامدی اور سفارشی لوگوں کا تقرر ہوتو اس قسم کے ادارے ابتداء ہی میں اپنا اثر ورسوخ ختم کر دیتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں مرکزی سطح پر اور صوبوں میں صوبائی سطح پر کئی نئے ادارے بنائے گئے۔مگر ان اداروں میں لائق، ذہین اور تربیت یافتہ افراد کی جگہ نااہل اور سفارشی لوگوں کو رکھا گیا، جس کی وجہ سے یہ ادارے اپنا کام کرنے میں ناکام رہے۔

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اس کے حکمراں طبقے بھی اوسط درجہ کے ذہن کے مالک ہیں، اور اس کے اداروں میں بھی نااہل اور غیر تربیت یافتہ لوگ بھرتی ہو گئے ہیں۔اس لئے آہستہ آہستہ یہ تمام ادارے اپنی اہمیت کھوکر ریاست اور عوام پر بوجھ بن گئے ہیں۔

اب ان سے چھٹکارا پانے کے لئے کہا جا رہا ہے کہ انہیں نجی ملکیت میں دیدیا جائے، اگر ریاست کے یہ ادارے، جو عوام کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنائے گئے تھے، اگر ان کو پرائیویٹ کردیا گیا، تو سوال یہ ہے کہ آخر پھر خود ریاست کے ادارے کا فائدہ کیا رہے گا۔

ٹیکس اور معاشرہ

پاکستانی معاشرہ موجودہ دور میں ٹیکسوں کی بھرمار کی وجہ سے پریشان ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے حکمراں طبقے اپنی سہولتوں اور عیش و آرام پر خرچ کر کے قوم کی دولت کو ضائع کرتے ہیں، تو دوسری طرف دفاعی اخراجات کی وجہ سے تعلیم، صحت اور ویلفیئر کے کام نہیں ہو پاتے ہیں، اور معاشرہ جہالت، بیماری اور پس ماندگی کی حالت میں چلا جا رہا ہے۔ جاگیردار اور صنعت کاروں دونوں ہی ٹیکسوں کی ادائیگی میں بے ایمانی کرتے ہیں۔ اس صورت میں سارا بوجھ عوام کو اُٹھانا پڑتا ہے، اور وہ اس بوجھ تلے دبے مایوسی اور نا اُمیدی کا شکار ہو رہے ہیں۔

حکومت اور ٹیکس کا مسئلہ تاریخ میں ہمیشہ سے بڑا متنازعہ رہا ہے، اور اس کی وجہ سے سیاسی اور سماجی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں اس کا اظہار کیا ہے کہ قبائلی اور خانہ بدوش لوگ ٹیکس کی ادائیگی کو غلامی کی علامت سمجھتے تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حکومت کو اس لئے ٹیکس دیا جاتا ہے کہ وہ ان کی حفاظت کرے گی، جب کہ ان کا خیال تھا کہ وہ خود اپنی حفاظت کر سکتے ہیں، اگر انہوں نے یہ فرض حکومت کے حوالے کر دیا تو ان کا کردار بدل جائے گا اور وہ حفاظت کے لئے دوسروں کے محتاج ہو جائیں گے۔

ریاست کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تشدد یا دہشت گردی کی اجارہ دار ہوتی ہے، کیونکہ اس کے پاس فوج ہوتی ہے کہ جس کی مدد سے وہ لوگوں سے زبردستی ٹیکس وصول کرتی ہے، اور لوگ اس لئے اس کی ادائیگی پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے پاس طاقت نہیں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے زرعی معاشرے میں ٹیکسوں کی ادائیگی کا سارا بوجھ کسانوں پر ہوتا تھا کہ جن کی زرعی پیداوار کو زبردستی ہتھیا لیا جاتا تھا اور اس کی آمدنی پر ریاست کے کے حکمراں اپنے محلات بناتے تھے، مقبرے تعمیر کرتے تھے، حرم رکھتے تھے اور عیش و آرام سے زندگی گزارتے تھے۔ جب کبھی کسان اس جبر کے

خلاف بغاوت کرتے تھے تو ان کی بغاوت کو سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔ چین کی تاریخ میں ہمیں کسانوں کی بغاوتوں کا ذکر ملتا ہے، یہ بغاوتیں ایشیاء کے دوسرے ملکوں اور یورپ میں بھی برابر ہوتی رہی ہیں۔

یورپ کی تاریخ میں ٹیکس کے نفاذ پر حکمرانوں اور فیوڈل لارڈز جن میں ہمیشہ سے جھگڑا رہا ہے، چونکہ حکمراں ہمیشہ جنگوں میں مصروف رہتے تھے اور یہ جنگیں اخراجات چاہتی تھیں، اس لئے حکمراں فیوڈل لارڈز سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ ان اخراجات کو پورا کریں، یہ اخراجات لوگوں پر ٹیکس لگا کر ہی پورے ہو سکتے تھے۔ اس لئے انگلستان میں جب اس کے بادشاہ جان (John) نے پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نئے ٹیکس نافذ کرنا چاہے تو پارلیمنٹ میں اس وقت فیوڈل لارڈز ہوتے تھے، انہوں نے اس کی مخالفت کی اور بادشاہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ اگر پارلیمنٹ نئے ٹیکسوں کی منظوری دیتی ہے تو اس صورت میں اسے سیاسی اور عدالتی مراعات دینی ہوں گی لہٰذا بادشاہ مجبور ہوا کہ 1215ء میں میگنا، کارٹا، یا بڑا چارٹر منظور کرے کہ جس میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ کوئی ٹیکس پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نہیں لگا سکے گا۔

عدالت میں مقدموں کا فیصلہ جیوری کے تحت ہوگا، اور کسی کو بغیر مقدمہ چلائے حبس بے جا میں نہیں رکھا جائے گا، اس قانون نے بادشاہ کی طاقت کو کم کر دیا اور پارلیمنٹ کے اختیارات کو بڑھا دیا۔

اس وقت یورپ کے دوسرے ملکوں میں ٹیکسوں کے سلسلہ میں بے انتہا ناانصافی ہوتی تھی، مثلاً امراء اور چرچ کے عہدے دار ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے، جب کہ کسان، کاریگر، تاجر، اور متوسط طبقے کے لوگ مختلف قسم کے ٹیکس ادا کرتے تھے۔ لہٰذا فرانس میں جب 1789ء میں انقلاب آیا ہے تو اس کی سوسائٹی میں ٹیکسوں کی یہ ناانصافی تھی، اسی لئے امراء، اور چرچ کے عہدے داروں اور بادشاہ کے خلاف لوگوں میں نفرت کے جذبات تھے، جس نے انقلاب کو جنم دیا، جس کے نعرے تھے، مساوات، آزادی، اور اخوت، ان نعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ پرانے نظام کے مراعات یافتہ طبقوں سے عاجز تھے اور معاشرے کو تبدیل کر کے مساوات پر معاشرے کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔

ٹیکسوں کے سلسلہ میں یورپ کے عوام کو اپنی ریاست کے علاوہ چرچ کے ٹیکس بھی ادا کرنا

ہوتے تھے۔ چرچ کے عہدے داران ٹیکسوں کی رقوم جمع کر کے اسے روم میں پوپ کے خزانہ میں جمع کرا دیتے تھے اس کے ایک طرف تو عوام معاشی بدحالی کا شکار تھے تو دوسری طرف حکمرانوں کو بھی اعتراض تھا کہ ان کے ملکوں سے خطیر رقم روم چلی جاتی ہے۔ اس لئے جب 1517ء میں مارٹن لوتھر نے پوپ سے بغاوت کی تو اس کی سرپرستی جرمنی کی ریاستوں اور ان کے حکمرانوں نے کی کیونکہ وہ پوپ کی اس بالادستی سے عاجز تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کی رقم روم جائے، اس نے عیسائیت میں تحریک اصلاح مذہب کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔ ورنہ اس سے پہلے اصلاح کی تحریکوں کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا تھا۔

امریکہ کی آزادی میں بھی ٹیکسوں کا دخل رہا ہے، جارج سوم کے عہد میں انگلستان اپنی ایمپائر کو وسعت دے رہا تھا، جس کی وجہ سے اس کے فوجی اخراجات میں اضافہ ہو رہا تھا، اس وجہ سے اس نے امریکہ کی کالونیز پر نئے نئے ٹیکس لگانا شروع کر دیئے۔ اس پر اہل امریکہ کی طرف سے احتجاج ہوا اور یہ نعرہ لگایا گیا کہ No taxation with one representation یعنی اس وقت کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے کہ جب تک پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی نہ ہو۔ اس نے بالآخر دونوں ملکوں میں جنگ کی ابتداء کی، اور امریکہ نے انگلستان سے آزادی حاصل کر لی، جس کی وجہ ناانصافی پر مبنی ٹیکس تھے۔

برصغیر ہندوستان میں جب بکسر کی جنگ (1764ء) کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ میں دیوانی کے حقوق ملے تو انہوں نے اس سختی اور جبر کے ساتھ کسانوں سے ٹیکس لئے کہ چند ہی سالوں میں بنگال کا خوش حال صوبہ مفلسی کا شکار ہو گیا، اور یہاں قحط سالی کی ایسی ابتداء ہوئی کہ اس نے لوگوں کو معاشی طور پر بدحال اور مفلس بنا دیا۔ کمپنی ٹیکسوں کی اس وصولی کے بعد اور زیادہ طاقت ور ہوئی اور اس کے مطالبات بڑھتے چلے گئے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں جب ہندوستانیوں کو شکست ہوئی، اور برطانوی اقتدار مستحکم ہو گیا تو حکومت نے اہل ہندوستان پر نئے ٹیکسوں کی بھرمار کر دی کیونکہ وہ اس سے فوجی خرچے کو پورا کرنا چاہتے تھے کہ جو 1857ء میں ان کا ہوا تھا۔ ہندوستانیوں کی شکست نے انہیں مجبور کیا کہ وہ برطانوی حکومت کے اخراجات کو بھی پورا کریں۔

لہٰذا تاریخ میں ٹیکسوں کی ناانصافی کی وجہ سے سیاسی اور معاشی تبدیلیاں آتی رہی ہیں، اس

نے معاشرے میں ابتری اور انتشار کو پیدا کیا ہے، لیکن اس کی وجہ سے انقلابات آئے، آزادی کی جنگیں لڑی گئیں، اور کہیں اس نے معاشرے کو پس ماندہ بنانے میں مدد دی اور عوام کو تعلیم اور صحت کی قیمت ادا کر کے، اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کیا۔

پاکستان میں اس وقت ٹیکسوں کی جو ناانصافی ہے، اس کی وجہ سے لوگ غربت اور مفلسی کا شکار ہو رہے ہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا لوگ اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کریں گے یا اسے برداشت کرتے رہیں گے؟

حکومت اور ٹیکس

ابن خلدون نے اپنی کتاب ''مقدمہ'' میں لکھا ہے کہ قبائل حکومت کو ٹیکس دینا باعث ذلت سمجھتے تھے کیونکہ ٹیکس کی ادائیگی کا مطلب تھا کہ اپنی آزادی اور خودمختاری کو ختم کر کے حکومت کی سرپرستی کو قبول کیا جائے۔ قبائل حکومت کے بجائے خود اپنا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسری طرف کوئی بھی حکومت بغیر ٹیکس کے قائم نہیں رہ سکتی ہے کیونکہ حکمران طبقے جن میں بادشاہ اور اُس کا خاندان شامل تھا فوج اور نوکر شاہی اور پجاری یہ دو طبقے تھے جو خود کسی پیداواری عمل کا حصہ نہیں تھے۔ اس لئے ان کے گذارے کے لئے اُن لوگوں سے ٹیکس لیا جاتا تھا جو پیداواری کاموں میں حصہ لیتے تھے جیسے کسان، کاریگر اور ہُنر مند۔ اس وجہ سے ٹیکس کا بوجھ عوام پر ہوتا تھا اور حکمران طبقے ان ٹیکسوں کی بنیاد پر امیرانہ زندگی گذارتے۔

ٹیکسوں کے نفاذ کی وجہ سے تاریخ میں انقلابات بھی آئے اور بڑی بڑی سیاسی تبدیلیاں۔ مثلاً 1215 عیسوی میں انگلستان کے جاگیرداروں نے بادشاہ سے میگنا کارٹا (Magna Carta) منظور کرایا کیونکہ اُس کی وجہ یہ تھی کہ ہر جنگ کے موقع پر بادشاہ اخراجات کے لئے نئے ٹیکس لگاتا تھا اور جاگیرداروں سے مطالبہ کرتا تھا کہ وہ بھی ایک خاص رقم جنگ کے لئے حکومت کو ادا کریں۔ اس معاہدے کے تحت یہ قرار پایا کہ بادشاہ کوئی ٹیکس پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نہیں لگا سکے گا۔ اس شِق کی وجہ سے ٹیکس کے نفاذ کے لئے بادشاہ پارلیمنٹ کا محتاج ہو گیا۔

ٹیکس کے نفاذ کی وجہ سے اٹھارہویں صدی میں انگلستان اور امریکہ کی تیرہ کالونیوں کے درمیان تصادم ہوا جب انگلستان نے اسٹامپ ڈیوٹی کے نام پر ٹیکس لگایا تو امریکہ کے لوگوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ بغیر نمائندگی کے کسی بھی ٹیکس کی ادائیگی نہیں ہوگی۔ (No taxation without Representation) یہی وہ وجہ تھی جو امریکہ کی آزادی کا

باعث بنی اورانہوں نے انگلستان کی حکومت سے چھٹکارا پایا۔

1789ء کے فرانسیسی انقلاب کی بنیاد بھی ٹیکس کے نظام کی خرابی پر ہوئی۔امراءاور چرچ کے عہدیدار کوئی ٹیکس ادانہیں کرتے تھے جب کہ اس کا سارا بوجھ عوام پر ہوتا تھا۔عوام نہ صرف حکومت کو طرح طرح کے ٹیکس ادا کرتے تھے بلکہ چرچ کو بھی ٹیکس دینا اُن پر لازم تھا۔ ٹیکس کے نظام کی اس ناانصافی کے خلاف بالآخر لوگوں نے بغاوت کی حکومت کا تختہ اُلٹا۔ بادشاہ، امراءاور چرچ کے عہدیداروں کواُن کی مراعات سے محروم کر دیا انہیں بھی عام لوگوں کی صف میں شامل کیا۔

برصغیر ہندوستان میں مغلوں کے زمانے میں کسانوں سے لگان وصول کیا جاتا تھا اور کسٹم ڈیوٹی کی صورت میں بھی حکومت کو آمدنی کے ذرائع تھے۔اکبر نے بادشاہ بننے کے بعد ہندوؤں پر جزیہ ختم کیا اور اُن کے کچھ مذہبی مقامات پر یاتریوں پر جو ٹیکس عائد تھے وہ بھی ختم کئے۔اس کی وجہ سے اکبر کو عوام میں بڑی مقبولیت ملی کیونکہ ٹیکسوں کا نفاذ لوگوں پر بوجھ ہوتا ہے اگر اُن کا خاتمہ کیا جائے تو اس سے عوام میں خوشحالی آتی ہے۔مغلیہ دورِ حکومت میں عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ نہیں تھا۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں طاقتور ہوئی تو 1764ء میں بکسر کی جنگ میں اُسے فتح ہوئی تو مغل بادشاہ کی جانب سے اُسے بنگال اور بہار میں دیوانی کے حقوق مل گئے یعنی زمین پر ریونیو یا لگان لینے کا اختیار۔کمپنی کے عہدیداروں نے کسانوں سے سختی کے ساتھ لگان وصول کرنا شروع کیا۔جس کی وجہ سے بنگال جو مغل حکومت کا سب سے زیادہ سرسبز اور پیداواری صوبہ تھا وہ چند ہی سالوں میں ویران اور بنجر ہو گیا جس کی وجہ سے یہاں مسلسل قحط آنا شروع ہو گیا۔جب بھی ٹیکسوں کی ادائیگی ظالمانہ طریقوں سے ہوتی ہے اور لوگوں کی آمدنی اور سہولیات کا خیال نہیں کیا جاتا تو اُس صورت میں ملک اور عوام دونوں ہی برباد ہو جاتے ہیں۔جب کمپنی کا پورے ہندوستان پر قبضہ ہوا تو اُس نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف ٹیکسوں کے نظام قائم کئے۔مثلاً بنگال میں اسے بندوبست دوامی کہا جاتا تھا۔اس کے تحت زمیندار کو ہر صورت میں ایک خاص حصہ بطور لگان ادا کرنا ہوتا تھا۔چاہے اُس کی فصل زرخیز ہو یا خشک سالی کا شکار۔غیر ادائیگی کی صورت میں اس کی زمین کو نیلام کر دیا جاتا تھا۔

ٹیکس کے ایک اور نظام کے تحت لگان کی وصولی پورے گاؤں سے کی جاتی تھی۔اس کا تیسرا طریقہ ''ریت واڑی'' کہلاتا تھا۔اُس میں کسان فرداً فرداً لگان کی ادائیگی کرتے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی وجوہات میں جو کمپنی کے خلاف لڑی گئی اُس کی ایک وجہ ٹیکسوں کا یہ نظام بھی تھا جس نے عوام کی معاشی حالت کو بدتر بنا دیا تھا۔

1857ء کی جنگ کے بعد جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت مستحکم ہوگئی تو انہوں نے 1860 عیسوی میں ہندوستانیوں پر انکم ٹیکس لگایا تا کہ 1857ء کی جنگ میں ہونے والے اخراجات کو اس ٹیکس کی مدد سے پورا کیا جائے۔اُس کے بعد سے یہ ٹیکس آج تک موجود ہے۔اسی طرح سے انگریزی حکومت نے ہندوستان میں عوام پر مختلف قسم کے ٹیکس لگائے۔

انگریزوں سے آزادی کے بعد عوام کو توقع تھی کہ ٹیکسوں کے نظام میں تبدیلی آئے گی اور اُن پر جو معاشی بوجھ ہے اُسے کم کیا جائے گا۔ پاکستان میں ہر آنے والی حکومت نے عوام پر بلواسطہ اور بلاواسطہ اُس قدر ٹیکس لگا دیئے ہیں کہ جن کی وجہ سے عوام کی زندگی دوبھر ہوگئی ہے۔ حکومت جب عوام سے ٹیکس وصول کرتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان کے بدلے میں عوام کو سہولتیں بھی فراہم کرے یعنی تعلیم ،صحت، جان و مال کا تحفظ اور عوامی فلاح و بہبود کے اداروں کا قیام۔ اگر اس کے بجائے حکومت ٹیکسوں کی آمدنی کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرے تو اس صورت میں یہ عوام کے استحصال کا باعث ہوگا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں ہر آنے والی حکومت اور اُس کے ذمہ دار ٹیکسوں کی آمدنی کو اپنے شاہانہ طرزِ زندگی کے لئے استعمال کرتے ہیں اور عوام بنیادی سہولتوں سے بھی محروم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں لوگ ٹیکسوں کے اس نظام سے نالاں ہیں کیونکہ اس نے اُن کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا ہے اور انہیں معاشرتی خوشحالی اور زندگی کی مسرتوں سے محروم کر دیا ہے۔

ہم اقتدار کیوں چاہتے ہیں؟

افراد میں اقتدار کی شدید خواہش اس لئے ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ انہیں طاقت اور اختیارات ملتے ہیں۔جن کے استعمال سے وہ اپنی شخصیت کو ابھارتے ہیں اور خود کو دوسروں کے مقابلے میں افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔اقتدار ایک فرد کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتا ہے اس کی زبان، لہجہ، چال ڈھال اور نشست و برخاست میں زبردست تبدیلی آ جاتی ہے۔اس کے چہرے کے خدوخال بدل جاتے ہیں۔اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اردگرد خوشامدیوں کا مجمع ہو جو اس کی تعریف اور توصیف کریں۔اس کے بدلے میں وہ اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے انہیں نوازتا ہے۔اس کی نوازش کی وجہ سے دوسرے لوگوں میں اس کی عزت اور بڑھ جاتی ہے، اقتدار اور اختیارات اس کو نہ صرف دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں بلکہ اس کی شخصیت اور کردار کی بھی نئے انداز میں تشکیل کرتے ہیں۔

اقتدار کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ایک قسم وہ ہے جس میں حکمراں اور بادشاہتیں ہیں۔حکمرانی اور بادشاہت کا تعلق عمومی طور پر شاہی خاندان سے ہوتا ہے۔اس لئے تخت و تاج کو حاصل کرنے کی خواہش خاندان کے افراد میں ہوتی ہے جو اس کے حصول کے لئے ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔جو کامیاب ہو جاتا ہے وہ دوسرے دعویداروں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیتا ہے اور مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے تخت نشین ہوتا ہے، اس حیثیت میں وہ بے پناہ اختیارات کا حامل ہوتا ہے، اس کا کہا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کی مخالفت کو بغاوت تصور کیا جاتا ہے اور بقایا لوگ اس کی رعیت ہوتے ہیں۔زندگی اور مال و دولت پر اس کو پورا پورا قابو ہوتا ہے، اقتدار کی اس شکل میں چاہے وہ رعایا پہ ظلم کرے یا ستم ڈھائے اس کو برداشت کیا جاتا ہے۔

حکمراں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے امراء اور عہدیداروں کو اختیارات دیتا ہے جن کی مدد سے وہ اس کی حکومت کو مستحکم بناتے ہیں اور رعایا کو قابو میں رکھتے ہیں۔

اقتدار کی اس شکل میں بادشاہ، امراء اور اعلیٰ عہدیدار اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور اپنے اختیارات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مال و دولت، جائیداد اور ملکیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ اقتدار انہیں آرام و آسائش اور مراعات دیتا ہے، اور لوگ ان کے احکامات کی تعمیل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

اقتدار حاصل کرنے کی ایک شکل وہ ہوتی ہے جبکہ کوئی فرد جس کا کسی شاہی خاندان سے تعلق نہیں ہوتا ہے۔ مگر وہ فوجی طاقت یا سازش کے ذریعہ اقتدار حاصل کر کے اپنی آمریت کو قائم کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال نپولین بونا پارٹ ہے۔ جو ایک فوجی عہدیدار تھا اس لئے فرانس کی حکومت کی غیر مقبولیت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوجی طاقت کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کیا، اور اپنی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کا اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اپنی شخصیت کو ابھارا جائے اور دوسرے ملکوں پر قبضہ کر کے اپنے خاندان کے افراد اور وفادار جرنیلوں کو نوازا جائے۔ لہٰذا اس میں اپنے اقتدار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی ذات کو بلند کرنے اور شان و شوکت حاصل کرنے میں صرف کیا۔

اس کی مثالیں ہمیں ان فوجی آمروں کی شکل میں ملتی ہیں کہ جنہوں نے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں فوجی طاقت کے ذریعہ قبضہ کر کے اقتدار حاصل کیا، اور ملک کا سربراہ بن کر فوقیت حاصل کی۔ ان کے اقتدار کا مرکز بھی ان کی اپنی ذات کے اندر محدود تھا۔ پاکستان میں اس کی مثال ایوب خان، یحییٰ اور ضیاء الحق اور مشرف ہیں۔

اقتدار کی تیسری شکل کا تعلق ان افراد سے ہوتا ہے کہ جو کسی نظریہ کسی بنیاد پر اقتدار میں آتے ہیں اور سوسائٹی کو تبدیل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔

جیسے جرمنی میں ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی ایک نظریہ کے تحت اقتدار میں آئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک خالص جرمن قوم کی تشکیل کی جائے۔ یہودیوں، خانہ بدوشوں اور دوسری نسل کے لوگوں کا خاتمہ کیا جائے اور یورپ میں جرمنی کی حاکمیت کو مسلط کیا جائے۔ اپنے دورِ اقتدار میں اپنی ذات کے لئے نہ تو کوئی دولت اکٹھی کی اور نہ کوئی جائیداد بنائی۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ جرمنی کی قوم میں آبائی خصوصیات کا احیاء کیا جائے اور ملک کو مضبوط اور مستحکم کیا جائے۔ اس کوشش میں اس نے جرمنی کو جنگوں میں الجھایا جو بالآخر جرمنی کی شکست اور اس کی خودکشی پر ہوا۔ جرمن قوم

کو نازی نظریہ کی ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

اس کی دوسری مثال لینن کی ہے کہ جس نے روسی انقلاب کی رہنمائی کی۔ اقتدار میں آنے کا اس کا مقصد یہ تھا کہ روسی مزدوروں اور عوام کو ان کے حقوق دیئے جائیں۔ زار روس کی حکومت کا خاتمہ کیا جائے اور ایک فلاحی ریاست کو قائم کیا جائے۔ جس میں ہر فرد کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ لینن نے اقتدار میں آنے کے بعد اپنی ذات کے لئے نہ تو دولت اکٹھی کی اور نہ اپنی شخصیت دوسروں سے ممتاز کرنے کی کوشش کی۔ یہی جذبہ ہم دوسرے انقلابی رہنماؤں میں دیکھتے ہیں۔ جن میں ماؤزے تنگ، چواین لائی، فیڈل کاسترو، چے گویرا اور ہوچی من شامل ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد استحصالی نظام کو بدلنے اور سوسائٹی کو عوامی فلاح و بہبود کے لئے تبدیل کرنے کا تھا۔

اقتدار اور اختیارات جو افراد کو بے پناہ طاقت دیتے ہیں۔ اگر کوئی بااقتدار شخص ان سے محروم ہو جائے تو اس کی زندگی میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اقتدار سے محرومی اس کی شخصیت اور کردار کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ مثلاً اس کی مثال مغل بادشاہ فرخ سیر کی ہے جب وہ تخت نشین تھا تو لوگ اس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ اس کے احکامات کو پورا کرتے تھے، لیکن جب اسے سیّد برادران نے بادشاہت سے محروم کر کے قید کیا تو اس صورت میں اس کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ عجز اور عاجزی کے ساتھ اپنے پہریداروں سے کھانے پینے اور لباس تبدیل کرنے کی درخواست کرتا تھا اور وہ اس کو مذاق میں ٹال دیتے تھے۔

اسی طرح جب نپولین کو سینٹ ہیلینا میں قید کیا گیا تو اس کی شان و شوکت رعب و دبدبہ سب کا خاتمہ ہو گیا۔ اقتدار کی محرومی نے اسے ایک معمولی قیدی بنا دیا۔ یہی صورت حال عراق کے آمر صدام حسین کی ہوئی۔ جو اپنے وقت کا ایک ظالم اور رعب دار آمر تھا۔ اقتدار کی محرومی نے اس کو ایک معمولی فرد کی حیثیت دیدی۔ تاریخ میں ہمیں اس کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتدار شخصیت کو کس طرح سے تبدیل کر کے اس کو یکسر بدل دیتا ہے، اور اس سے محرومی اسے ایک بار پھر ایک معمولی فرد کی حیثیت دیدیتی ہے، لیکن ان باتوں کے باوجود افراد اقتدار کے حصول کے لئے اصول اور اخلاق کو قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اقتدار چاہے وقتی ہی کیوں نہ ہو لوگ اس کے حصول کے لئے اور اس کے ذریعہ خوشی اور مسرت حاصل کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

سنسر شپ

برٹولڈ بریخت ایک جرمن ڈرامہ نویس، شاعر اور ادیب تھا۔ اس کی ایک مختصر سی نظم میں اس نے نازی پارٹی کے لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ پارٹی کے نظریہ کے خلاف کتابوں کو جلا رہے تھے تو اس کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان میں اس کی کوئی کتاب نہ تھی۔

تاریخ میں ریاستیں، حکومتیں، جماعتیں اور افراد ان تحریروں کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ممنوع ٹھہراتے ہیں اور ان پر پابندیاں عائد کرتے ہیں کہ جو ان کے نظریے اور عقیدے کے خلاف ہوں۔

قدیم عہد میں چونکہ کتابوں کی تعداد محدود ہوتی تھی اس لئے ان پر پابندیاں لگانا بھی آسان تھا۔ لیکن جب چھاپے خانے کی ایجاد ہوئی اور کتابوں کی اشاعت میں زبردست اضافہ ہوا تو قدامت پرست اور روایت پسند طبقے ان خیالات اور افکار سے گھبرا گئے کہ جو ان کو چیلنج کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال سے ممنوعہ کتابوں اور نظریوں کو تخریب کاری قرار دے کر ان پر پابندیاں لگائی گئیں۔ تا کہ پہلے سے قائم شدہ ادارے روایات اور نظریات کو چیلنج نہیں کیا جا سکے اور لوگوں میں نئی فکر کو روکا جا سکے۔

جب مارٹن لوتھر نے کیتھولک چرچ کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا تو اس کی کتابیں شائع ہو کر پورے یورپ میں پھیل گئیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں چرچ کی بدعنوانیوں اور پوپ کے لامحدود اختیارات پر تنقید ہونے لگی۔ ورنہ اس سے پہلے جن افراد نے کیتھولک چرچ میں اصلاح کی بات کی تھی انہیں سختی سے کچل دیا گیا کیونکہ ان کے نظریات محدود رہے، اور لوتھر کی طرح سے وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے۔

لوتھر اور اس کے ہم خیال اصلاح پسندوں کی تحریروں پر پابندی عائد کرنے کے لئے پوپ

نے انڈیکس کے سلسلے کو زیادہ وسیع کیا۔ انڈیکس کا یہ وہ سلسلہ تھا جو چودہ سو ترانوے (1493) میں چرچ نے شروع کیا تھا تاکہ ان کتابوں پر پابندی عائد کی جائے جو اس کے عقائد کے خلاف ہیں۔ چرچ کی جانب سے ممنوعہ کتابوں کی یہ فہرست باقاعدہ شائع ہوتی تھی اس میں ان کتابوں اور مصنفوں کا اندراج ہوتا تھا۔ جن کے پڑھنے پر کیتھولک مذہب کے پیروکاروں کو منع کیا گیا۔ خاص طور سے وہ کتابیں جو پروٹسٹنٹ ملکوں میں شائع ہوتی تھیں کیتھولک ملکوں میں ان پر پابندیاں تھیں۔ چرچ کے عہدیداران تمام جہازوں کی تلاشی لیتے تھے جو کیتھولک علاقوں میں آتے تھے۔ اگر کوئی کتاب جس کا نام انڈیکس میں شامل ہوتا تھا اگر وہ پائی جاتی تھی تو اسے ضبط کرلیا جاتا تھا۔ انڈیکس کی اس فہرست میں نئی کتابیں اور نئے مصنفوں کے نام شائع ہوتے تھے۔

فرانس میں روشن خیالی کے عہد میں جب کہ نئے نئے فلسفیانہ افکار ابھر رہے تھے اور چرچ اور عقائد پر تنقید ہو رہی تھی تو اس وقت چرچ اور حکومت کی جانب سے سنسر شپ کے ذریعہ ایسی کتابوں پر پابندیاں لگانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض صورتوں میں ممنوعہ کتابوں کو سرِ عام جلایا بھی گیا۔ لیکن چھاپے خانے کی ایجاد اور اشاعت کی سہولتوں نے کتابوں کی اشاعت کو مزید بڑھایا اور ممنوعہ کتابیں خفیہ طور پر چھپ کر لوگوں تک پہنچنے لگیں۔ مذہبی عقائد پر تنقید کی جانے والی کتابوں کے علاوہ وہ تحریریں بھی قابل گرفت ٹھہریں کہ جو سیاسی طور پر نظامِ حکومت اور حکمرانوں پر تنقید کرتی تھیں۔ نپولین جب اقتدار میں آیا تو اس نے ان تمام اخباروں اور رسالوں اور کتابوں پر پابندیاں عائد کیں کہ جو اس کی حکومت اور اس کی پالیسیوں پر تنقید کرتے تھے۔

نپولین کی شکست کے بعد جب یورپ کے حکمرانوں نے پرانے نظامِ حکومت اور اداروں کو مستحکم کیا تو انہوں نے ایسے تمام نظریات کی مخالفت کی جو کہ تبدیلی کے حامی تھے۔ چنانچہ آسٹریا کے چانسلر میٹرنِک نے ایسے قوانین جاری کئے کہ جن کے تحت یہ دیکھا جاتا تھا کہ یونیورسٹیوں کے طالب علم کونسی کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہ کتابیں حکمرانوں کے اقتدار کے لئے خطرناک ہیں۔ چنانچہ سخت سنسر شپ کے ذریعہ نئی اور لبرل سوچ کی تحریروں پر پابندیاں عائد کیں۔

سیاسی تحریروں پر یہ پابندیاں اب بھی ان ملکوں میں عائد ہیں کہ جہاں بادشاہتیں یا آمرانہ حکومتیں ہیں۔ کیونکہ یہ نئی سوچ اور فکر کی تحریروں سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ جمہوری ملکوں میں بھی ایسی تحریریں جو ان کے نقطہءِ نظر سے باغیانہ ہیں انہیں معاشرے کے لئے خطرناک سمجھ کر ان پر

سنسر لگایا جاتا ہے۔ تیسرے نقطۂ نظر میں وہ کتابیں ممنوع قرار پاتی ہیں کہ جنہیں معاشرے کی قدامت پرست رویوں کے خلاف غیر اخلاقی سمجھا جاتا ہے، ایسی کتابوں کو فحش قرار دے کر ان کی اشاعت بند کروائی جاتی ہے۔ ان کتابوں کے مصنفوں پر فحش نگاری کے الزامات، عدالتوں میں مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ جیسے سعادت حسن منٹو کے بعض افسانوں کو فحش قرار دے کر ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ان کے کچھ افسانوں کو نصاب میں شامل کیا گیا تو محکمہ تعلیم کی جانب سے ان افسانوں کی اصلاح کر دی گئی اور وہ حصے خارج کر دیئے گئے جو اس کی نظر میں قابل گرفت تھے۔

کتابوں پر پابندیوں کے سلسلے میں جماعتیں اور افراد بھی اپنے طور پر فیصلہ کرتے ہیں مثلاً خاندان کا سربراہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو کونسی کتابیں پڑھنی چاہئیں اور کونسی کتابوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب بہشتی زیور میں کتابوں کی ایک بڑی طویل فہرست دی ہے کہ لڑکیوں کو کونسی کتابیں پڑھنی چاہئیں اور وہ کتابیں بھی ہیں کہ جن کو پڑھنے سے ان کے خیال میں لڑکیوں کے کردار اور اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔

ان ممنوعہ کتابوں میں خاص طور سے شاعروں کے دیوان اور مثنویاں شامل ہیں۔ وہ لڑکیوں کے کردار کی مضبوطی کا اس قدر خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے قرآن شریف کی سورۃ یوسف کے پڑھنے سے بھی انہیں منع کیا ہے۔

اگرچہ پوری تاریخ میں اس بات کی کوشش ہوتی رہی ہے کہ لوگوں میں نئی فکر اور سوچ اور آگاہی پیدا نہ ہو، لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود ذہن بدلتا رہا ہے اور آج بھی برابر نئی فکر کی تلاش میں نئی کتابوں اور نئے مصنفوں کی تحریروں کو تلاش کر رہا ہے۔

لکھائی کا مواد

دنیا کی بڑی تہذیبوں میں رسم الخط کی ایجاد کانسی کے زمانہ میں، یعنی 2500 قبل مسیح میں ہوئی۔ تحریر کے لئے ہر تہذیب نے علیحدہ علیحدہ مواد تیار کیا کہ جس کو استعمال کر کے انہوں نے اپنے نظام حکومت، عقائد، اور ادب کو محفوظ کیا۔ سمیری تہذیب جو موجودہ عراق میں پیدا ہوئی، انہوں نے لکھائی کے لئے مٹی کی تختیوں کو استعمال کرنا شروع کیا۔ ان گیلی تختیوں پر لکھ کر انہیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ موم کی تختیوں کا استعمال بھی ہوا، اس کا فائدہ یہ تھا کہ ان پر لکھی تحریر کو مٹا کر انہیں دوبارہ استعمال کیا جا سکتا تھا، جب کہ مٹی کی تختیوں کو صرف ایک بار تحریر کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

ان تختیوں پر جو مواد ملا ہے، اس میں حکومت کے احکامات ہیں، قوانین ہیں، ٹیکس کا حساب کتاب ہے، تاجروں کی خط و کتابت ہے جو انہوں نے اپنے ساتھیوں اور خاندان کے ساتھ دوسرے ملکوں سے کی تھی، اور داستانیں ہیں، گل گامیش کی داستان بھی انہیں تختیوں پر ملی ہے، اس رسم الخط کو خط میخی کہا جاتا ہے۔ اس کی دریافت کے بعد سمیری تہذیب کی تاریخ اور اس کے رسم و رواج کے بارے میں اہم معلومات ملی ہیں۔

لکھائی کے لئے پتھر کی بڑی بڑی سلوں کو بھی استعمال میں لایا گیا۔ ان پر حکومت قوانین اور احکامات کندہ کرا کے انہیں عام جگہوں پر رکھتی تھی تا کہ لوگ ان کو پڑھ سکیں۔ اس قسم کی تحریریں مندروں اور ستونوں پر بھی کندہ کرائی جاتی تھیں۔

مصر میں لکھنے کے لئے پے پائی رس (Pay Pyras) کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ یہ ایک درخت کے مواد سے تیار ہوتا تھا، جسے کوٹ کر ورق کی شکل بنائی جاتی تھی، اور پھر اسے خشک کر کے اس پر لکھائی کا کام ہوتا تھا۔ ان کی شکل بنڈلوں کی ہوتی تھی، جنہیں محفوظ کر کے کتب خانوں میں

رکھا جاتا تھا۔

پومپی آئی (Pompy I) کا شہر جو آتش فشاں پہاڑ کے لاوے میں دفن ہو گیا تھا، اس کے ایک گھر سے پاپائے رس کے بنڈل ملے ہیں، جن پر یونانی فلسفہ تحریر ہے۔ اسکندریہ کی مشہور لائبریری میں بھی یہ بنڈل کتابوں کی شکل میں تھے۔ بحر مردار (Dead Sea) جو ڈیڈ سی اسکرول (Dead Sea Scorol) کہلاتے ہیں، یہ اردن میں غاروں سے ملے ہیں، جو ایک یہودی فرقے میں اپنے عقائد پر لکھے تھے اور مخالفوں کے ڈر سے انہیں یہاں چھپا دیا تھا۔ انہیں غاروں میں ان بنڈلوں کے علاوہ پیتل کی پتلی پتلی پلیٹوں پر بھی اس فرقے کی تحریریں ملی ہیں۔

کانسی کے عہد میں، اور کاغذ کی ایجاد ہونے تک پاپائے رس کا استعمال لکھائی کے لئے رہا ہے۔ اس کی وجہ سے اہم تاریخی مواد آج مؤرخوں کو دستیاب ہے۔

ہندوستان میں لکھائی کے لئے درخت کے بڑے خشک پتوں کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ انہیں دھاگے کے ساتھ جوڑ کر کتاب کی شکل دیدی جاتی تھی۔ چین میں ابتداء میں لکھائی کے لئے بانس کے بنے ورقوں کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ ان پر یہ برش کے ذریعہ لکھائی کرتے تھے۔

ان کے علاوہ لکھائی کے لئے بھیڑ کی کھالوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے نوزائدہ بھیڑ کے بچے کی کھال بہترین سمجھی جاتی تھی۔ اسے مکمل طور پر خشک کیا جاتا تھا، اور پھر چکنا کر کے لکھائی کی جاتی تھی چونکہ یہ قیمتی مواد تھا، اس لئے لکھتے وقت کوئی حاشیہ یا پیراگراف نہیں چھوڑے جاتے تھے اور اس لکھائی کے مواد کو پوری طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ اس نایاب لکھائی اور قیمتی مواد کے ورقوں کو دھاگے سے باندھ کر کتاب کی شکل دی جاتی تھی۔

بادشاہ اور امراء ہی اپنے کتب خانوں کے لئے قیمتی کتابیں خرید سکتے تھے۔ طالب علم ایک ایک کتاب کے لئے میلوں سفر کرتے تھے، یا ملکوں ملکوں گھومتے تھے۔

لکھائی کے اس مواد میں اس وقت انقلابی تبدیلی آئی کہ جب چین میں کاغذ کی ایجاد ہوئی، اس نے لکھائی کے لئے سستا مواد فراہم کیا۔ یہ ایجاد چین تک محدود نہیں رہی، بلکہ عربوں نے ان سے سیکھ کر کاغذ کے کارخانے بغداد اور غرناطہ میں قائم کئے، اور آٹھویں صدی میں ان سے اہل یورپ نے سیکھا۔

جب تیرہویں صدی میں ترکوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو کاغذ بنانے کا یہ فن ہندوستان

لے کر آئے۔ کاغذ کی اس ایجاد اور اس کے استعمال نے علم کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اب خوش نویسوں، کاتبوں، اور کتابوں کو نقل کر کے لکھنے والے طبقوں کا وجود عمل میں آیا۔ جنہوں نے علم کے پھیلاؤ میں بڑا حصہ لیا۔

کتابیں جو بادشاہوں اور امراء کو دستیاب تھیں، کاغذ کی ایجاد کی وجہ سے اب وہ عام طالب علموں اور عالموں کی پہنچ میں آ گئیں۔ کاغذ کی وجہ سے نہ صرف علم و ادب کو فائدہ ہوا، بلکہ اس کی وجہ سے ریاست کا ادارہ بھی مضبوط ہوا، کیونکہ اب ٹیکسوں کا حساب کتاب، اور دربار کے عہدے داروں کے درمیان خط و کتابت ہونے لگی، جس کی وجہ سے ریاستی امور کو سلجھانے میں آسانی ہوئی۔

کاغذ کے بعد دوسرا انقلاب، جس نے علم کی حدود کو پھیلایا وہ چھاپہ خانہ کی ایجاد تھی۔

ان ایجادات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی ذہن برابر سوچتا رہتا ہے۔ وہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا اور منجمد نہیں رہتا ہے۔ ذہن کی اسی سوچ کے نتیجہ میں انسانی تہذیب ترقی کرتی ہے۔

پیدل چلنا

طبقاتی معاشرے میں پیدل چلنے والوں اورسواری کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والوں میں سماجی فرق ہوتا ہے۔اس لئے امراءاورحکمراں طبقے کےلوگ اپنے وقت کے حساب سے سواریاں رکھتے تھے۔ ہندوستان میں ہاتھی،گھوڑے، اور پالکیاں ہوتی تھیں کہ جو امراءوشرفاء کے لئے بطورسواری کے کام آتی تھیں۔غریب،غرباء پیدل سفرکرتے تھے،یاایک شہر سے دوسرے شہرجانا ہوتاتو گاڑی یا تانگے میں کرایہ دےکراپنا سفر پورا کرتے تھے۔

بادشاہوں اور امراء کے لئے سواری کے ہاتھیوں، اور گھوڑوں کے اصطبل ہوتے تھے، پالکیاں اُٹھانے کے لئے پیشہ ورکہار ہوتے تھے، جواس مشقت کے عادی ہوجاتے تھے۔

اس طبقاتی فرق کی وجہ سے پیدل چلنے والوں کوحقارت سے دیکھا جاتا تھا،اورکسی پرطنز کرنا ہوتا تھا تو اسے پیدل کہہ کراس کی بےعزتی کی جاتی تھی،اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کا کوئی سماجی مرتبہ نہیں ہے۔شطرنج کےکھیل میں بھی سب سے کم درجہ کے مہرے پیدل یا پیادے کہلاتے ہیں کہ جن کا کام اپنے سے اعلیٰ مرتبہ کے مہروں کی حفاظت ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں پیدل چلنے کےفوائدسامنے آرہے ہیں،مثلاً ایک تو اس کی وجہ سے جسمانی ورزش ہو جاتی ہے، پیدل چلنے والا گرمی اور سردی کو برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ دوسرے جب پیدل چلنا ہوتا ہےتو راستے میں لوگوں سےسلام دعا ہوتی رہتی ہےاور یہ دوستی کی جانب لے جاتی ہے۔اگرآپ سواری میں ہیں، تو پیدل چلنے والوں یا دوسرے دوستوں سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوتا ہے۔اس لئے پیدل چلنے سےلوگ ایک دوسرے کےقریب آجاتے ہیں۔ راستے میں اگردکانیں ہیں،تو دکانداروں سے سلام دعا ہوتی ہے،اوراس طرح شہرکےلوگ آپس میں ایک دوسرے سےشناسائی پیدا کرتے ہیں۔

دوسرے پیدل چلنے والا اپنے اردگرد کے ماحول سے واقف ہوتا ہے وہ نہ صرف راستوں سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ عمارتوں، دکانوں اور ماحول سے واقف ہوکر اپنے علم اور تجربہ کو بڑھاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں جب میں گھر سے اسکول، کالج اور یونیورسٹی جایا کرتا تھا تو پیدل چلنے کی وجہ سے راستے میں لوگوں سے سلام دعا ہوتی تھی۔ جن سے سلام دعا نہ ہوتی تھی تو ان کے چہروں سے ضرور واقفیت ہوجاتی تھی اور جب یہ لوگ کبھی دوسرے شہر میں ملتے تو یہ واقفیت دوستی میں بدل جاتی تھی۔ اس رشتہ اور ناطے کے باعث شہر، اس کے باسیوں، اور اس کے ماحول سے اس قدر انسیت ہوجاتی تھی کہ پھر دوسری جگہ دل نہیں لگتا تھا۔

یورپ اور امریکہ کے شہروں میں پیدل چلنے والوں کے بہت زیادہ حقوق ہیں۔ ان کے لئے سڑکوں کی دونوں جانب چوڑے فٹ پاتھ ہیں، تاکہ لوگ آرام سے چل سکیں۔ سڑک پار کرنے کے لئے علیحدہ سے ٹریفک لائٹ ہے، تاکہ وہ حفاظت کے ساتھ دوسری جانب جاسکیں۔ زیبرا کراسنگ ہے کہ جس پر قدم رکھ دیا جائے تو پورا ٹریفک رک جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں پیدل چلنے والوں کے لئے تمام سہولتوں کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔ پرانے فٹ پاتھوں پر دکانداروں کا قبضہ ہے، یا سڑکیں چوڑی کرنے کی وجہ سے ان کا سائز کم کردیا گیا ہے۔ سڑک پار کرنے کے لئے علیحدہ سے کوئی ٹریفک لائٹ نہیں ہے، لہٰذا لوگ جان پر کھیل کر سڑک پار کرتے ہیں اور حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔

شہروں میں فاصلوں کی وجہ سے بھی اب پیدل چلنے کا رواج ختم ہوگیا ہے۔ بسوں اور ویگنوں میں اس قدر رش ہوتا ہے کہ اس میں سوار ہونا اور اترنا دونوں بے انتہا خطرناک ہیں۔ اس ماحول میں لوگوں سے دوستی اور رابطے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ لوگوں کو اپنی جان کے ساتھ اپنے مال کی بھی حفاظت کرنی ہوتی ہے کہ جیب کتروں کے ہاتھوں لٹ نہ جائیں۔

اس ماحول میں پیدل چلنا، اذیت ناک ہوگیا ہے، اور لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی نے کسی شکل میں ان کی اپنی سواری ہو۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی صحت اس سے متاثر ہوئی ہے، اور ذہنی طور پر بھی وہ ہر وقت دباؤ کا شکار رہتے ہیں، پیدل چلنے کے جو فوائد ہیں، اور جن سے لطف اٹھانا چاہیئے، اور اس کو زیادہ سے زیادہ پُرمسرت بنانا چاہیئے۔ اس کے تمام موقعے تقریباً ختم ہوگئے ہیں۔ اب پیدل چلنے کی سہولت گاؤں اور چھوٹے شہروں تک محدود ہوکر رہ گئی ہے، اور

اب ڈاکٹروں کے مشورے پر لوگ چہل قدمی کر کے اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں، لیکن بطور صحت اب پیدل چلنا شہروں میں ناممکن ہوگیا ہے۔ اب سماج میں طبقاتی فرق کار، بس اور ویگن میں سفر کرنے والوں کے درمیان قائم ہوگیا ہے۔

شہروں میں جو نئی آبادیاں قائم ہو رہی ہیں ان میں فٹ پاتھ کا وجود نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو پیدل چلنے والوں کے حقوق کا کوئی احساس نہیں ہے۔ ان کے خیال میں شہروں میں صرف سواری والوں کے حقوق ہیں۔ یہ فرق اس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے کہ معاشرے میں مراعات یافتہ طبقے تمام سہولتوں کے مستحق ہیں جب کہ غریب لوگ بے سہارا اور بے بس ہیں۔

تبدیلی کیسے آتی ہے

انسانی معاشرہ ایک جگہ ٹھہرا ہوانہیں رہتا ہے۔ بلکہ وقت کے ساتھ برابر بدلتا رہتا ہے۔اس تبدیلی کی وجوہات اندرونی اور بیرونی عناصر ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی معاشرے میں کوئی فنی ایجاد ہوتی ہےتو یہ ایجاد اس کے اندر تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔انسان کی ابتدائی تاریخ میں پتھر کے اوزار اور ہتھیاروں سے لے کر اب تک جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ایجادات ہوئی ہیں انہوں نے معاشرے کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔مثلاً موجودہ زمانے میں کمپیوٹر کی ایجاد نےعلم کے پھیلاؤ میں اور انسانی رابطوں میں بے انتہا اضافہ کیا ہے۔ایجادات کی وجہ سے انسان کے رہن سہن، عادات و اطوار اور زبان میں تبدیلی آ جاتی ہےاس کے نتیجے میں نئے پیشے اور نئے ہنر پیدا ہوتے ہیں۔

کارل مارکس کے نزدیک تبدیلی اس وقت آتی ہے کہ جب ذرائع پیداوار اور نظامِ پیداوار کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔اس مرحلے پر معاشرے کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ نئے نظام کی ابتداء کرے۔ مارکس کے نزدیک طبقاتی جدوجہد بھی سوسائٹی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ جیسے انسان نے غلامی سے جاگیرداری اور جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف سفر کیا، اور اب موجودہ زمانے میں سرمایہ داری میں جو تضادات ہیں وہ نئے نظریات اور افکار کو پیدا کر کے معاشرے کو نئے قالب میں ڈھالیں گے۔تبدیلی لانے والوں میں ایک طبقہ تاجروں کا ہوتا ہے۔ جو دنیا کی دوسری تہذیبوں اور قوموں سے رابطہ کر کے نئے خیالات اور افکار سے اپنے معاشرے کو روشناس کراتا ہے۔عہد وسطیٰ میں اس کی مثال ان تاجروں سے ہے جو سفر کے خطرات کے باوجود بحری اور بری راستوں سے دور دراز کے ملکوں میں گئے اور تہذیبوں کو آپس میں ملایا۔سیاحوں نے اپنے سفرناموں کے ذریعہ لوگوں میں دوسرے ملکوں کے کلچر کے بارے میں آگاہی دی۔ جیسے ابنِ بطوطہ کا سفرنامہ یا مارکو پولو کا سفرنامہ۔

تبدیلی اس وقت بھی آتی ہے جب کوئی حملہ آور کسی ملک پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس کی فوجی فتح کے ساتھ ساتھ وہ سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر بھی شکست خوردہ یا مقبوضہ ملک پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی مثال برصغیر ہندوستان پر برطانوی حکومت کی ہے۔ جس نے مغربی تہذیب اور ثقافت کو ہندوستان میں روشناس کرایا اور اس کے مقامی کلچر کو بدل کر رکھ دیا۔

موجودہ دور میں گلوبلائزیشن کی وجہ سے جس طرح سے ملکوں کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی شعبوں میں تبدیلی آ رہی ہے اس نے ایک طرف تو قومی کلچر کو متاثر کیا ہے تو دوسری طرف قومی شناخت بھی کمزور ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں دو رجحانات اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ ایک رجحان تو یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کا مقابلہ کرنے کے لئے ماضی کی روایات اور اداروں کا احیاء کیا جائے۔ کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ پرانی اقدار کو بحال کر کے قومی شناخت کو برقرار رکھا جا سکے گا۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ دنیا کی ترقی کی اس رفتار میں گلوبلائزیشن کو اختیار کر کے دوسری قوموں کے برابر رہا جائے۔ کیونکہ گلوبلائزیشن اور اس کا عمل ترقی کی علامت ہے۔ ایک خیال یہ بھی کہ گلوبلائزیشن کے عمل میں انتخاب کیا جائے اور ان چیزوں کو لیا جائے کہ جو معاشرے کے لئے فائدہ مند ہیں۔

تبدیلی کا عمل معاشرے کی ذہنی تخلیق کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ قدیم روایات رسم و رواج اور نظریات کی بنیاد پر ایک جگہ ٹھہر جائے اور اس پر یقین کرنے لگے کہ انہیں میں اس کی ترقی کا راز ہے۔ تو اس صورت میں نئی سوچ اور فکر کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایک ایسا نظام کہ جو مستحکم بنیادوں پر ہو وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ انسانی ذہن کو اس پر تیار رہنا چاہئے کہ حالات کے تحت تبدیلی کو قبول کرے۔ قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے درمیان کش مکش ہر معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتی ہے، اور تصادم ذہنوں کو تازگی دیتا ہے۔ اس تنازع میں قدامت پرست طبقے بھی اپنے جواز کے لئے استدلال بھی لاتے ہیں اور اپنے نظام میں اصلاح کر کے یہ کوشش کرتے ہیں کہ نئے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ ترقی پسند حلقے کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے کے ٹھیراؤ کو بدل کر اس میں رفتار اور تیزی پیدا کریں تا کہ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی بھی شرکت ہو۔

قدامت پرست حلقے اکثر ٹیکنالوجی اور اس کی ایجادات کو قبول کرنے اور استعمال کرنے

میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ٹیکنالوجی کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔اس صورت میں ٹیکنالوجی کا استعمال منفی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ٹیکنالوجی اسی وقت مفید اور مثبت ہوتی ہے کہ جب اس کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی اور معاشی نظریات کو بھی نئے حالات کے تحت تخلیق کیا جائے۔ترقی پسند نظریات اور ٹیکنالوجی یہ دونوں مل کر سماج کو مثبت انداز میں بدل لیتے ہیں۔

تبدیلی کا ایک اور ذریعہ انقلاب ہوتا ہے اس میں سماجی نظام کی اصلاح کی بجائے اس کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کی جگہ نئے ادارے اور روایات کی تشکیل کی جاتی ہے۔اس وجہ سے انقلاب ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے کیونکہ جب تک اس کے رہنماؤں میں تخلیقی صلاحیتیں نہ ہوں وہ پرانے نظام کی جگہ نیا نظام لانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس لئے اکثر انقلابوں کی ناکامی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اس کے لانے والے ایک موثر متبادل نظام قائم کرنے میں ناکام رہے۔

شہروں کا مسخ ہونا

عمارتیں کسی بھی معاشرے اور سماج کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں، ان عمارتوں کی تعمیر اور ان کے ڈیزائن سے اس کی جمالیاتی پختگی اور ناپختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مزید برآں عمارتیں معاشرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہیں، کہ ان میں کیا ندرت ہے، کیا جدت ہے، اور کیا فنکارانہ اظہار ہے؟

عمارتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک حکومت کی دولت، طاقت اور اقتدار کے ساتھ ساتھ اس کے نظریہ اور اس کے نظریات کی عکاسی کرتی ہیں، دوسری جانب عام لوگوں کی رہائش گاہیں ہوتی ہیں، ان میں طبقاتی فرق نظر آتا ہے، امراء کے محلات ہوتے ہیں یا غرباء کے کچے مکانات جو وقت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں، اس لئے بعد میں تاریخی عمارتیں رہ جاتی ہیں کہ جو ماضی کے بارے میں ہمیں مواد فراہم کرتی ہیں، ان عمارتوں کی تعمیر کے اندر ان کا اپنا عہد اور وقت پوشیدہ ہوتا ہے، مورخ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو تلاش کر کے اس کی تشکیل نو کرے۔

پاکستان کے قیام کے بعد اسلام آباد ایک نیا شہر ہے کہ جسے ایک خاص منصوبہ کے تحت بسایا گیا ہے، لہٰذا اس کی عمارتیں بھی نئی ہیں، اور صاحب اقتدار طبقہ کے ذہن کی عکاسی کرتی ہیں، اس کی حکومتی عمارتوں میں پارلیمنٹ ہاؤس، عدالت عالیہ، صدر اور وزیراعظم کے لئے رہائشیں، اور سیکریٹریٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ان عمارتوں کے ڈیزائن کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں نہ تو عہد مغلیہ کی روایات نظر آئیں گی اور نہ ہی برطانوی دور کے آثار، نہ ہی آزادی کے بعد کا نیا ذہن، کہ جس سے ان عمارتوں کے ذریعہ ایک نئی قوم پیدا ہونے کے شواہد نظر آئیں۔ نہ ان عمارتوں میں خوبصورتی ہے، اور نہ تخلیقی صلاحیتوں اور فن کا اظہار۔

تقسیم کے بعد پاکستان کے حصہ میں ایک تو وہ تاریخی شہر تھے کہ جو عہد وسطیٰ سے آباد چلے

آ رہے تھے، دوسرے وہ شہر تھے کہ جو برطانوی دورِ حکومت میں آباد کئے گئے تھے۔ ان دونوں شہروں کی طرزِ تعمیر میں فرق نظر آتا ہے، مثلاً مغلیہ دور کے شہر فصیلوں میں گھرے دروازوں والے تھے۔ یہ شہر تنگ گلیوں اور پیچیدہ راستوں کے تھے۔ جبکہ کالونیل شہر کھلے ہوتے تھے کیونکہ اب بیرونی حملوں کا خوف نہیں رہا تھا۔ برطانوی شہر چوڑی اور سیدھی سڑکوں والے تھے۔

شہروں کا یہ ورثہ جو آزادی کے بعد ہمیں ملا اس میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ آبادی کے اضافہ، اور ٹریفک کے بڑھنے کی وجہ سے یہ سوچا گیا کہ سڑکوں کو چوڑا کیا جائے، اور اس کے لئے اگر درختوں کو کاٹنا پڑے تو انہیں ترقی کے نام پر قربان کر دیا جائے۔ لہٰذا یہ سلسلہ شروع ہوا تو سڑک کنارے لگے ہوئے درخت کٹنا شروع ہو گئے۔

اس ضمن میں شہر لاہور کا ذکر ضروری ہے، یہ وہ واحد شہر ہے کہ جس میں عہد مغلیہ اور برطانوی دور کی عمارتیں اچھی حالت میں موجود ہیں۔ جو اس شہر کی تاریخی شناخت کو ابھارتی ہیں۔ ایک زمانہ میں یہ باغوں کا شہر کہلاتا تھا، مگر اب ان باغوں کے نام رہ گئے ہیں اور باغات ختم ہو گئے ہیں۔

جب یادگار پاکستان کے نام پر مینار بنایا گیا تو ہمارے ماہر تعمیرات نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کے ماحول میں شاہی مسجد کے مینار ہیں، اور قلعہ کی بلند و بالا فصیلیں ہیں لہٰذا مینار کا ڈیزائن بھی اس کی مناسبت سے ہونا چاہئے تھا، مگر یہ ڈیزائن ایفل ٹاور کی ایک بھدی کاوش ہے، جس نے اس ماحول کو خراب کر دیا ہے۔ یادگار پاکستان کا یہ مینار تاریخ سے کٹا ہوا نظر آتا ہے۔

لاہور شہر کا بگاڑ اس وقت شروع ہوا جب پبلک ٹرانسپورٹ کم سے کم ہوتی چلی گئی اور شہری اس پر مجبور ہوئے کہ ہر صورت میں اپنی ٹرانسپورٹ کا بندوبست کریں، لہٰذا کاریں، موٹر بائیک، اور سائیکلوں کے ساتھ ساتھ رکشہ اور بسیں ان سب نے مل کر ٹریفک کے مسائل کو جنم دیا۔

دوسرے ملکوں میں اس کا حل یہ ڈھونڈا گیا ہے کہ انڈر گراؤنڈ ریلیں چلائی جائیں تا کہ زمین کے اوپر ٹریفک کا دباؤ کم ہو، لاہور میں زیرِ زمین ریلوے کے بجائے زمین کے اوپر ہی ٹریفک کی سہولتیں فراہم کرنے کا سوچا گیا، اور اس مقصد کے لئے فلائی اوور بنائے گئے۔ ان پلوں کی تعمیر نے شہر کی تاریخی عمارتوں کو تباہ کیا ہے اور شہر کا حسن ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے شہر میں ہائی ویز بنائے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے پیدل چلنے والوں کے لئے انتہائی مشکلات ہو گئی ہیں۔

پرانے شہر میں جہاں فٹ پاتھ ہیں، ان پر دکاندار قابض ہیں، اور نئی بستیوں میں فٹ پاتھ کا

وجود ہی نہیں ہے۔اس لئے شہر صرف ان لوگوں کے لئے ہے کہ جن کی اپنی ٹرانسپورٹ ہو، جو اس سے محروم ہیں، ان کے لئے اس شہر میں چلنے پھرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آبادی کے بڑھنے کے ساتھ جب رہائش کے مسائل آئے تو بے ہنگم، بھدے اور بدصورت پلازوں کی تعمیر شروع ہوگئی، انہوں نے نہ صرف شہر کے ماحول کو بگاڑا، بلکہ اس کی خوبصورتی کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔

شہر لاہور کو جس طرح حکومتی اداروں، بلڈرز، اور نودولتیے طبقے نے مسخ کیا ہے، اس کی وجہ سے اس کی شناخت اور پہچان ختم ہوگئی ہے۔شہروں کے مسخ کرنے کے پس منظر میں ہمارا ذہن ہے کہ انہیں شہر سے کوئی لگاؤ اور محبت نہیں ہے بلکہ وہ اسے اپنے منافع اور ذاتی خواہشات کے تحت مسلسل تباہ کر رہا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ ایک شہر کی تباہی نہیں ہے، بلکہ سماج کے کلچر اور اس کی روایات کی تباہی ہے۔اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اس سے ہماری قومی شناخت بھی متاثر ہوگی۔

پاکستانی سماج اور کلچر

ماہرین سماجیات نے کسی بھی مہذب اور ترقی یافتہ سماج میں دو مختلف قسم کے کلچروں کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں سے ایک اعلیٰ کلچر (High Culture) ہوتا ہے، جس کا تعلق اشرافیہ یا طبقہ اعلیٰ سے ہوتا ہے جب کہ دوسرا مقبول عام کلچر (Popular Culture) ہوتا ہے، جس میں عوام شامل ہوتے ہیں۔

ان دو مختلف کلچروں کی بنیاد پر سماج میں طبقاتی فرق قائم ہوتا ہے، طبقہ اعلیٰ کے لوگ اپنے کلچر کو افضل، برتر، اور زیادہ مہذب سمجھتے ہیں اور مقبول عام کلچر کے بارے میں ان کی رائے حقارت پر مبنی ہوتی ہے، اس فرق کی وجہ سے خود عوام بھی فرد کو اشرافیہ کے مقابلہ میں کم تر سمجھنے لگتے ہیں۔ پاکستان میں ان دو کلچروں میں اب بہت زیادہ فرق ہو گیا ہے۔

انگریزی دور حکومت میں جب انگریزی سرکاری زبان ہوئی، تو اس نے تعلیم یافتہ طبقے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف جدید تعلیم یافتہ لوگ تھے جو انگریزی زبان سے واقف تھے، جب کہ دوسری جانب فارسی، عربی، یا سنسکرت کے تعلیم یافتہ قدامت پرست لوگ تھے۔ لہٰذا وہ جدیدیت سے دور اور ماضی کی روایات کے امین اور حامی تھے۔ زبان کی بنیاد پر دونوں طبقوں کی سوچ اور عادات میں فرق آتا چلا گیا اور اس نے دو علیحدہ علیحدہ کلچر اور ان کی روایات کو پیدا کیا۔

پاکستان کے اولین دور میں تعلیمی اداروں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ پبلک اسکولوں کے طالب علموں کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی آتی تھی، جب یہ طالب علم کالج اور یونیورسٹی میں جاتے تھے تو وہاں انگریزی ذریعہ تعلیم تھا، جسے یہ لوگ آسانی کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ ابتداء میں صرف مشنری اسکول میں انگریزی ذریعہ تعلیم تھا، جب کہ پبلک اسکولوں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس وقت نجی اسکول تجارتی بنیادوں پر قائم نہیں تھے، بلکہ ان کو

سماجی ادارے چلاتے تھے، اس لئے اسلامیہ اسکولوں کے نام سے، یہ اسکول پاکستان کے کئی شہروں میں تھے جہاں یا تو تعلیم مفت تھی یا فیس معمولی تھی۔

1970ء کی دہائی میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب بنگلہ دیش آزاد ہوا۔ ایک نئے پاکستان کی ابتداء ہوئی۔ آبادی کے بڑھنے اور دفاع کے اخراجات نے پبلک اسکولوں کی حالت کو خراب کرنا شروع کر دیا۔ سیاسی ماحول نے اس کو اور زیادہ بگاڑا۔ جب قدیم نجی تعلیمی ادارے قومیائے گئے تو اس کی وجہ سے اساتذہ میں ملازمت کا تحفظ ہوا، اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتنی شروع کر دی۔ ٹیوشن جس کا اس سے پہلے کوئی رواج نہیں تھا، اب اس نے اساتذہ کو مزید کمائی کی جانب ترغیب دی اور کلاس میں پڑھانے کے بجائے، ان کی توجہ ٹیوشن پر زیادہ ہوگئی۔

اس خرابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے تعلیمی ادارے کھلنا شروع ہوئے کہ جن کا بنیادی مقصد تجارت تھا، تعلیم کی خدمت نہیں تھا۔ یہ نجی ادارے اشرافیہ کے لئے باعث کشش ہوئے، کیونکہ ان میں فیسوں کی شرح بہت زیادہ تھی، اور ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ اس نے تعلیم کو اردو اور انگریزی میڈیم میں تقسیم کر کے دو مختلف طبقوں کے فرق کو بڑھایا۔ ان انگریزی میڈیم اسکولوں نے اپنے امتحان کو کیمبرج یا لندن بورڈ سے منسلک کر دیا، جب کہ اردو میڈیم کے اسکول میٹرک کے امتحان کے لئے مقامی تعلیمی بورڈ سے منسلک ہے۔ لہٰذا منطقی طور پر او اور اے لیول کے طلباء کی اہمیت بڑھ گئی، اور میٹرک پاس طلباء ان کے مقابلہ میں کم تر ہو گئے۔

اب تک اسکول کے بعد انگریزی اور اردو میڈیم کے طلباء کالج اور یونیورسٹی میں جا کر مل جاتے تھے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ اشرافیہ کے لئے کالج اور یونیورسٹی بھی علیحدہ ہو گئے جو کہ اس قدر مہنگے ہیں کہ ان میں متوسط طبقے کے طالب علم تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ اس نے دو طبقوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی جانتے ہیں، وہ اردو سے ناواقف ہیں، نہ تو وہ اسے لکھ سکتے ہیں اور نہ صحیح طریقے سے بول سکتے ہیں۔ جبکہ اردو میڈیم کے تعلیم یافتہ، انگریزی سے ناواقف ہیں، اور احساس کم تری میں مبتلا ہیں کہ وہ اس کی وجہ سے معاشرے میں باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

ان دو زبانوں کے فرق کے ساتھ ساتھ، دو کلچر ایک دوسرے سے جدا پیدا ہو گئے ہیں۔ انگریزی داں طبقہ کے لئے علم کے دروازے زیادہ کھلے ہوئے ہیں، کیونکہ اس زبان میں جو علم و ادب کی تخلیق ہو رہی ہے، اردو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ اسی لئے یہ طلباء زیادہ وسیع النظر اور دنیا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں جبکہ اردو داں طبقے کو اردو میں جو سہولتیں ملتی ہیں، وہ محدود ہیں، اس لئے ان کا علم بھی اسی طرح سے محدود ہے۔

زبان کے اس فرق نے جہاں دو علیحدہ علیحدہ کلچروں کی بنیاد رکھی، اس نے سماج کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا، اشرافیہ مغربی تہذیب سے متاثر اور دنیا کو اس کی نظر سے دیکھتی ہے۔ جبکہ اردو داں طبقہ اپنے محدود دائرے میں رہتے ہوئے دنیا کے بارے میں تنگ نقطہ نظر رکھتا ہے۔

معاشی نظام کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں لوگوں کی روزمرہ کی زبان، اور عام بول چال میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اردو زبان میں بولتے وقت انگریزی کے الفاظ مل کر پورے پورے جملوں کو بولا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب ٹی وی پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہوتا ہے تو اس میں ایک ایسی زبان بولی جاتی ہے جو نہ تو انگریزی ہوتی ہے اور نہ اردو۔ یہ وہ زبان ہے کہ جسے عام لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر اب تعلیم یافتہ لوگ فخر یہ اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اور اپنے علم کا رعب عام لوگوں پر ڈالتے ہیں۔

زبان کی اس ملاوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن کس قدر انتشار کا شکار ہے۔ ہمارے پاس موزوں الفاظ اور جملوں کی کمی ہے کہ جن کی مدد سے ہم اپنا مافی الضمیر بیان کر سکیں۔ اس سے ہمارا کلچر بھی انتشار کا شکار ہے اور اس سے ہماری شناخت بھی متاثر ہو گئی ہے۔

لیکن ان حالات میں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے کہ جس میں ہم اپنے تعلیمی نظام کو بدل سکیں اور دو طبقوں کے بجائے ایک ہی قسم کا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کریں کہ جو علم و ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔

سندھ کے شہروں اور قصبوں کی تاریخ کیسے لکھی جائے؟

تاریخ کا مضمون ٹھہرا ہوا یا جامد نہیں ہے، بلکہ اس میں برابر نئے نظریات اور تحقیق کی روشنی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب مورخ حکمرانوں اور ان کی جنگوں سے بیزار ہو کر تاریخ میں عام لوگوں کے کردار، ان کی روزمرہ کی زندگی، اور تاریخ کے بنانے میں ان کے اشتراک اور حصہ کو ایک اور دوسری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اگر عام لوگوں کی تاریخ لکھی جائے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ چھوٹے شہروں اور قصبوں اور دور دراز کے علاقوں کی تاریخ کی تحقیق کی جائے اور ان شہروں اور بستیوں میں رہنے والے عام لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے، تو اس کے نتیجہ میں ایک خوبصورت اور دلچسپ کلچرل تاریخ کی تشکیل ہوگی۔

شہروں اور قصبوں کی زندگی میں کلچر کا بڑا فرق اس لئے ہوتا ہے کہ شہر میں سیاسی، مذہبی، تعلیمی اور تجارتی سرگرمیاں ہوتی ہیں، یہاں کی آبادی میں شاعر، ادیب، مصور، فن کار، ہنر مند، کاریگر، استاد، شاگرد، پہلوان، اور دوکاندار شامل ہوتے ہیں، جو شہر کی زندگی کو مصروف رکھتے ہیں، جبکہ قصبہ یا گاؤں میں زندگی محدود ہوتی ہے۔ کسان صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کر کے کچھ وقت باہم گذارتے ہیں، ان کی روزمرہ کی زندگی میں تبدیلی بہت کم آتی ہے، سوائے تہواروں، شادی بیاہ، وفات، عرس اور میلوں کے موقعوں پر ورنہ زندگی ایک جگہ ٹھہری ہوئی رہتی ہے، اگرچہ اب حالات بدل گئے ہیں، سڑکوں کی تعمیر، بسوں، ریلوے، اور ویگنوں کے ذریعہ شہروں سے رابطوں نے گاؤں کی زندگی کو تبدیل کر دیا ہے، اس تبدیلی اور اس کے اثرات کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہماری سوسائٹی اب بھی مردوں کے تسلط میں ہے، عورتیں اب بھی سرگرمیوں میں کم نظر آتی ہیں، ان کی دنیا اب بھی مردوں سے علیحدہ ہے، اگرچہ شہروں میں اب حالات بدل رہے ہیں۔ مگر

اس تبدیلی نے عورت کے سماجی مرتبہ کو بھی نہیں بدلا ہے۔

تاریخ سے بچوں کو بالکل خارج کر دیا جاتا ہے، ان کا خاندان میں کیا مقام ہوتا ہے، ان کی تعلیم و تربیت کا تعلق معاشرے کے طبقاتی تعلق سے ہوتا ہے، ان کی ذہنی کیفیت اور ساخت ان کے ماحول کے مطابق بن جاتی ہے۔ اگر ان کا تعلق نچلی ذاتوں سے ہوتا ہے تو ان کی صلاحیتیں اور ذہانت بچپن ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی خواہشیں ان کے طبقاتی تعلق سے دم توڑ دیتی ہیں۔ ان کے لئے زندگی میں ترقی کرنے یا آگے بڑھنے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ سوسائٹی بدل رہی ہے۔ قدامت پرستی اور جدیدیت کے درمیان کش مکش جاری ہے، روایتی پابندیاں ٹوٹ رہی ہیں، ان حالات میں ایک انتشار کی کیفیت ہے مگر جب انتشار ختم ہوگا تو اس کے نتیجہ میں ایک نیا معاشرہ جنم لے گا۔

سندھ کی تاریخ کے کلچرل اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کی تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ سندھ کے مشہور شہروں اور قصبوں کی جدید تاریخ کو، ان لوگوں کے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں لکھا جائے کہ جنہوں نے تاریخ کو بدلتے اور تشکیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مثلاً سندھ کے مشہور شہروں کو لیا جائے جن میں حیدرآباد، سکھر، لاڑکانہ، شکارپور، میرپور، خیرپور، دادو، سہون، ٹھٹھہ، سانگھڑ، ٹنڈو جام اور مٹھی ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں سے ان کی اپنی زندگی کے تجربات جس کا تعلق شہروں کی روزمرہ کی زندگی سے ہے ان کی یادداشتوں پر مبنی تفصیلات کو لکھوایا جائے یا ان سے انٹرویو کرائے جائیں کہ وہ جن کی عمر 40، 70، یا اس سے زیادہ ہے، انہوں نے اپنے شہر کو بچپن، جوانی اور آخر عمر میں کیسے تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ خاص طور سے پاکستان کے بعد، تقسیم کے نتیجہ میں شہروں کی آبادی میں تبدیلی سے اس کا کلچر کس طرح سے متاثر ہوا ہے۔ تقسیم سے قبل جب ان شہروں میں ہندو، سکھ، پارسی اور عیسائی رہتے تھے تو اس وقت ان کے مذہبی تعصّبات کیا تھے، ان کے دوستانہ تعلقات میں مذہب کس حد تک رکاوٹ تھا، یا وہ مذہبی رواداری کے ساتھ رہ رہے تھے یا تعصّبات کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور تھے، اس طرح سیاسی، سماجی اور ثقافتی روایات کے بارے میں ان سے گفتگو کر کے اس عہد کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

شہر یا قصبہ کے بارے میں، یا ان کی روزمرہ کی زندگی کے بارے میں جن سے انٹرویو لئے

جائیں، ان میں ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں استاد، دکاندار، پہلوان، مزدور، کسان، کاریگر، فن کار، شاعر، ادیب، مصور، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کام کرنے والے بیرے۔ ان سے گفتگو کے بعد، ہر شہر کی مذہبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوگا کہ ایک عام آدمی کی زندگی کیسے اور کس طرح سے وقت کے ساتھ بدل رہی ہے، اس تبدیلی کے ساتھ اس کی ذہنی حالت اور اس کے جذبات اور اس کی خواہشات نیا رنگ اختیار کر رہی ہیں۔

تبدیلی لوگوں کے لباس، کھانے، عادات، رسم ورواج، مکانوں کی تعمیر، فرنیچر اور زبان میں نئے الفاظ کے اضافوں کے ساتھ ہو رہی ہے۔

اگر اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے سندھ کے کلچر ڈیپارٹمنٹ اور اس کی یونیورسٹیوں کے تاریخ کے شعبے کام کریں، تو سندھ کی ایک ایسی کلچرل تاریخ اُبھرے گی جو اب تک لوگوں کے درمیان پوشیدہ تھی، اس کے نتیجہ میں شہروں کے وہ کلچرل ادارے بھی اُبھر کر سامنے آئیں گے کہ جن کے تاریخی کردار کو اب تک فراموش کر دیا گیا تھا۔ ان اداروں میں لوگوں کے گھروں کی محفلیں، بیٹھکیں اور آپس کا میل جول ہے۔ وہ ہوٹل ہیں کہ جو عام لوگوں کو آپس میں ملنے کے مواقع دیتے تھے۔ ان ہی محفلوں میں مشاعرے، جلسے، جلوس، عرس، میلے ٹھیلے، اور بازار ہیں، کہ جو لوگوں کی زندگی میں تازگی اور شگفتگی پیدا کرتے رہے ہیں۔ اس میں شہر کے محلوں کی تاریخ کو لکھا جا سکتا ہے، ان محلوں کی سماجی زندگی، اور یہاں کے باسیوں کے باہمی تعلقات زندگی میں کیا تبدیلی لاتے تھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتوں اور بچوں کو تاریخ سے خارج نہیں کیا جائے، ان کو بھی اس کی تشکیل میں برابر کا حصہ دیا جائے۔

اگر سندھ کی تاریخ کو اس اسلوب اور انداز سے لکھا گیا تو یہ ایسی تاریخ ہوگی کہ جس کا تعلق عام لوگوں سے ہوگا، اور یہ سندھ کی تاریخ کو زیادہ خوبصورت اور دلکش بنائے گی۔

انسانی تاریخ کا مثالی عہد

تحریری تاریخ سے قبل پتھر کے زمانے میں انسان اپنی ارتقائی منازل طے کر کے ہوش مند انسان کی شکل اختیار کر چکا تھا، اب وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اس قابل تھا کہ اپنے ماحول کو تبدیل کر سکے، اور اپنی ذہنی جدت کا اظہار کر سکے۔

یہ دور شکار اور غذا جمع کرنے کا تھا۔ اس عرصہ میں اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ پتھر سے کس طرح اوزار بنائے جائیں۔ شکار کو کس طرح ماہرانہ انداز میں گھیرا جائے، اور اس کے ساتھ ہی اس نے آگ کو بھی دریافت کر لیا تھا، جس سے وہ سردیوں کے موسم میں گرمی حاصل کرتا تھا، وحشی جانوروں کو دور رکھتا تھا، اور گوشت کو بھون کر کھانے بھی لگا تھا۔

وہ خانہ بدوشی کی حالت میں رہتا تھا، اور اس لئے گروہ کی شکل اختیار کر لی تھی جس میں 15 سے 20 تک افراد شامل ہوتے تھے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کو اس کے آثار ملے ہیں، جہاں ہڈیوں اور آگ کے شواہد سے اس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ غاروں میں بھی رہتا تھا، اور آثار سے معلوم ہوا ہے کہ وہ مردوں کو نہ صرف دفن کرتا تھا، بلکہ ماتمی کھانا بھی کھاتا تھا، کیونکہ قبروں کے ساتھ کھانے کی ہڈیاں ملی ہیں۔ یہ بھی شواہد ہیں کہ وہ اپنے گروہ کے ان افراد کی نگہداشت کرتا تھا جو کہ زخمی ہو جاتے تھے اور غذا کا حصول نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے باہمی رشتوں اور تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ خود بھی شکار کرتا تھا، اور دوسرے جانور جب شکار کو کھا کر ادھورا چھوڑ دیتے تھے تو بعد میں یہ اس میں سے اپنا حصہ لے کر کھاتا تھا، گوشت کو کاٹنے کے لئے اس نے تیز دھار کے پتھر کے اوزار بنائے تھے۔ خاص طور سے وہ ہڈیوں کا گودا ضرور کھاتا تھا، جو صحت کے لئے ضروری تھا۔

ماہرین کے نزدیک وہ غذا کے حصول کے لئے تین سے چار گھنٹے صَرف کرتا تھا، بقایا وقت

میں، جوفرصت کے لمحات ہوتے تھے، ان میں وہ رقص، موسیقی اور آپس کے میل ملاپ کی نذر کرتا تھا۔ ساتھ رہنے اور شکار کی وجہ سے اس نے بول چال کی زبان دریافت کر لی تھی کیونکہ ماہرین کے مطابق وہ بغیر زبان کے کسی بڑے جانور کا شکار نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ شاید محنت کی تقسیم کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا، عورتیں اور بچے بھی جڑی بوٹیاں، اور سبزیاں جمع کرتے تھے جبکہ مرد شکار کرتے تھے اور جو بھی حاصل ہوتا تھا، اسے سب مل کر کھاتے تھے۔ اشتراک کا اصول باہمی اتحاد کے لئے ضروری تھا، اب تک کسی فرد کا اپنا علیحدہ سے کسی چیز پر دعویٰ نہیں تھا۔ شکاری اور غذا کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ غاروں میں ملنے والا آرٹ ہے۔ یہ فرانس اور اسپین کے غاروں میں دریافت ہوا، تو ماہرین اس کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ مصوری میں اس وقت کے جانوروں کی تصاویر ہیں، رنگوں کو جس خوبصورت انداز میں استعمال کیا گیا ہے اس سے آرٹسٹ کی تخلیقی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رنگ اس نے پودوں، پھولوں اور جڑوں سے بنائے تھے۔ ان تصاویر میں انسان نہیں ہیں جانور ہیں، کچھ غاروں میں انسانوں کے چھوٹے مجسمے ضرور ملے ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ ان تصاویر کی غرض یا تو مذہبی تھی، یا آنے والی نسل کی شکار کے لئے تربیت۔

کہا جاتا ہے کہ جب پکاسو نے اسپین کے ایک غار میں ان تصاویر کو دیکھا تو اس نے کہا کہ ان کے بعد آرٹ زوال کی حالت میں ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پتھر کے اس عہد میں انسان نے جو کچھ حاصل کر لیا تھا، اس کی بنیاد پر آگے چل کر تہذیب کی بنیاد پڑی۔

جب انسان قدیم پتھر کے زمانے سے جدید پتھر کے دور میں داخل ہوا، تو یہ ایک انقلابی قدم تھا، کیونکہ اب شکار اور غذا کے مرحلہ سے گذر کر اس نے زراعت اور کاشت کاری کو اختیار کیا، جانوروں کو سدھایا اور انہیں پالنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے فرصت کے اوقات ختم ہو گئے اور اب اسے دن رات محنت و مشقت کرنی پڑی، کیونکہ کھیتی باڑی کے لئے زمین کھودنا، اس میں بیج ڈالنا، پھر جب فصل تیار ہو تو اس کو پرندوں سے محفوظ اور جانوروں سے حفاظت کرنا، اس کے بعد فصل کی کٹائی اور اناج۔

اس عہد میں اس کے مذہبی عقائد کی بھی ابتداء ہوئی ہے، کیونکہ فصل کی کامیابی کے لئے ہوا، پانی اور آب و ہوا کی ضرورت تھی اس لئے اس نے دیوی و دیوتاؤں کو تخلیق کیا اور ان سے فصل کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

اس عہد کے جو مقامات آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے دریافت کئے ہیں، ان میں سے سب سے پرانا گاؤں فلسطین کا جراکو ہے جو دیواروں سے گھرا ہوا تھا، قیاس ہے کہ یہ یا تو حملہ آوروں سے حفاظت کے لئے تھیں یا یہ گاؤں کو سیلاب سے بچانے کے لئے تھیں۔ دوسرا قصبہ جو اس عہد کا ملا ہے جو 7 ہزار ق۔م کا ہے شتل ہویوک، اناطولیہ ترکی میں ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب قصبہ ہے، کیونکہ اس میں تمام مکانات ایک لائن میں ہیں، کوئی گلی نہیں ہے، گھروں میں اندر جانے کے لئے باہر کوئی دروازہ نہیں ہے بلکہ یہ راستہ چھت سے جانے کا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ چھت سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ گھروں میں رہائشی کمرے ہیں، جہاں رات کو سونے کے لئے چبوترا ہے، باقی ضرورت کا سامان کمرہ میں اور صحن میں ہے۔ عمارت کے اندر ایسے کمرے بھی ہیں کہ جو شاید عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہوتے ہوں۔ یہ لوگ مُردوں کو بھی انہیں مکانات میں دفن کرتے تھے۔ اس بستی کے باسی زراعت سے وابستہ تھے اور قریبی بستیوں سے لین دین اور تجارت بھی کرتے تھے۔

اس عہد کا دوسرا شہر جو 7 ہزار ق۔م کا ہے وہ بلوچستان میں مہرگڑھ ہے، جس کے مکانات کچی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں، یہ لوگ مُردوں کو معہ ان کے ضروری سامان کے دفن کرتے تھے۔ یہاں سے جو اشیاء ملی ہیں، ان میں زراعتی اوزار اور آلات کے ساتھ ساتھ زیورات بھی ملے ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہاں سب سے پہلے کپاس کی کاشت کے بارے میں معلومات ملی ہیں۔

پتھر کے زمانہ کے اس ارتقائی سفر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان مرحلہ وار برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ تحریر ایجاد نہیں ہوئی ہے، مگر لوگ زبانی روایات کے ذریعہ اپنا تہذیبی ورثہ آگے والی نسلوں کو منتقل کر رہے تھے۔ اس ارتقائی سفر سے انسان کے عزم وارادے، اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر ماحول کے مطابق خود کو تبدیل کرتا ہے اور انسانی تہذیب کو مزید آگے کی جانب لے جاتا ہے۔

اس لئے تاریخ حوصلہ دیتی ہے کہ انسان شکست تسلیم نہیں کرتا ہے، بلکہ مشکلات پر قابو پا کر ان کا حل دریافت کرتا ہے۔ مزاحمت انسانی کردار کا ایک اہم حصہ ہے جس کی بدولت وہ اس دنیا میں زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے طویل عہد ہے جو دس ہزار سال کی مدت پر محیط ہے۔

شخصیت یا افکار

پس ماندہ معاشرے میں افکار و خیالات کے معاملے میں شخصیت کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے معاشرے میں شخصیت تقدس کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ اپنے مسائل کو کیسے حال کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ نظریات و افکار سے زیادہ شخصیتوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان سے نظریات کو منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مقاصد کو حاصل کیا جائے۔ مثلاً مذہبی انتہا پسندی کے خلاف جب رواداری کی بات ہوتی ہے تو اس کے لئے وہ صوفیاء کی تعلیمات کا سہارا لیتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کے فروغ سے انتہا پسندی کا خاتمہ ہو جائے گا اور لوگوں میں رواداری کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔

یہ سوچ اس لئے پیدا ہوئی ہے، کیونکہ لوگ تاریخ اور اس کے عمل سے واقف نہیں ہیں، تاریخ میں افکار و نظریات خاص حالات اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، جن کی تبلیغ اور فروغ میں شخصیات کا کردار ہوتا ہے۔ صوفیاء بھی عہد وسطیٰ کے معاشرے کی پیداوار تھے، جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو ایک ایسے ماحول کی ضرورت تھی کہ جس میں مذہبی تنازعات اور جھگڑے نہ ہوں، اس مقصد کو صوفیاء نے بخوبی پورا کیا۔ اس لئے ریاست کی سر پرستی بھی انہیں حاصل تھی۔ کیونکہ انہوں نے حکمرانوں کے استحصال کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اور نہ مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ آج کے دور میں حالات بدل گئے ہیں۔ اب صوفیاء سے زیادہ تعلیم، نصاب تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی اہمیت بڑھ گئی ہے کہ جن کے ذریعے نظریات یا افکار کی اشاعت ہوتی ہے۔ لوگوں میں وسعت نظری اور رواداری کو زیادہ موثر طریقہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں جب صوفیاء کے کردار کو اُبھارا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں سجادہ نشینوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

پھر جوان کے وارث ہونے کے ناطے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ جب یہ سیاست میں آتے ہیں تو ان کے مرید بغیر کسی تردّد کے ان کو ووٹ دے کر کامیاب کرتے ہیں اور ایک استحصالی جماعت کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہیں۔ صوفیاء کے مزار اب لوگوں کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے رہ گئے ہیں۔ اس لئے اگر اس دور میں صوفیاء کے کردار کو ابھارا گیا تو اس کے نتیجہ میں جہالت، مذہبی تعصب اور غلامانہ ذہنیت پیدا ہوگی، جو معاشرے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوگی۔

اس طرح جب بائیں بازو کے دانشور قائداعظم محمد علی جناح کی 11-اگست کی تقریر کے حوالے سے سیکولرازم کی بات کرتے ہیں، تو دوسری جانب سے دائیں بازو کے لوگ ان کی ان تقریروں کا حوالہ دیدیتے ہیں کہ جن میں مذہب کی بات کی گئی ہے۔ اس لئے اگر جناح صاحب کو چھوڑ کر یہ بات کی جائے کہ تاریخ میں مذہب اور سیاست کا کیا رشتہ رہا ہے، کیا اس نے معاشرے کی ترقی میں حصہ لیا ہے یا یہ رکاوٹ بنا ہے، تو اس صورت میں لوگوں کو سیاسی شعور دینا زیادہ بہتر ہوگا۔

بائیں بازو کی جماعتوں میں ایک یہ رواج اور ہو گیا ہے کہ جب بھی امن کی بات ہو تو اس کے لئے فیض کے نام کو استعمال کر کے امن میلہ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ فیض صاحب بہت اچھے شاعر تھے، مگر امن کو ان سے منسوب کر کے اسے ایک تنگ دائرے میں بند کرنا ہے، اس لئے اگر امن کی بات کی جائے تو اس کے مقابلہ میں لوگوں کو بتایا جائے کہ جنگوں یا مذہبی تنازعات نے تاریخ میں کس قدر خوں ریزی کی کہ جس کے نتیجہ میں ملک تباہ ہوئے، اس لئے امن معاشرے کی ترقی اور لوگوں کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے ضروری ہے۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ معاشرے میں شخصیت کے نام پر یا محض نظریات کی تبلیغ سے تبدیلی نہیں آتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے طبقاتی نظام کو بدلنے کی جدوجہد کی جائے، اولیت طبقاتی شعور کو دینا چاہئے، اس کے بعد اس کے لئے معاشرے میں تاریخی شعور کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جس کے بعد آپ شخصیت اور نظریات کی اہمیت کو پوری طرح سے سمجھیں گے اور اپنی تقدیر بنانے میں آزاد ہوں گے۔

شخصیت پرستی کا ایک نقصان یہ ہے کہ اس میں تخلیق سے زیادہ تقلید پر زور دیا جاتا ہے۔ جب کسی شخص کو ایک ماڈل بنایا جاتا ہے تو لوگ اس جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان

کی اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے شخصیتوں کی تخلیق پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے تاریخی کردار کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ہماری نصابی کتابوں میں خیالات وافکار اور تحریکوں کے بجائے شخصیتوں کو اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے طالب علم نظریات اور تحریکوں کی روح سے ناواقف رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نصاب میں جدت، تخلیق اور آزادیء رائے کا فقدان ہے۔ جب سیاست میں شخصیت پرستی آتی ہے تو اس کے نتیجے میں سیاسی رہنما کے گرد روایات کے حالہ بنا کر اسے ایک عظیم فرد بنا دیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر اس کا خاندان اور اس کی جماعت اس کے نام اور نعروں پر لوگوں کے جذبات کو اُبھارتی ہے اور اپنے سیاسی مقاصد پورے کرتے ہوئے اقتدار میں آنے کی جدوجہد کرتی ہے۔

کام کا تاریخی پس منظر

انسانی سماج میں کام کن کن مراحل سے گذرا ہے، اور اس کا کن حالات میں مفہوم بدلتا رہا ہے، اور سماج میں اس کو کیسے اور کیونکر نئے معنی دیئے جاتے رہے ہیں۔ اس مضمون میں مختصراً اس کا جائزہ لیا جائے گا۔

انسانی سماج کے ابتدائی دور میں کام کی غرض اور مقصد تھا کہ کس طرح سے غذا کو حاصل کیا جائے۔ اس لئے غذا جمع کرنے اور شکار کے عہد میں انسان کے کام کی غرض و غایت یہ تھی کہ اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ جب وہ اپنے کام کے ذریعہ یعنی پھلوں، جڑوں، اور سبزیوں کو جمع کر کے یا شکار کر کے غذا حاصل کر لیتا تھا تو اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد اسے مزید اور کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

لیکن جب انسان نے کھیتی باڑی شروع کی، اور بستی بسائی تو اب اس کے کاموں کی تعداد بڑھ گئی۔ کاشتکاری محنت و مشقت کا کام تھا، اسے زمین کھود کر اس میں بیج ڈالنا ہوتا تھا پھر کھیت کی حفاظت بھی ضروری تھی، جب فصل تیار ہوتی تو اس کی کٹائی اور فصل کو محفوظ مقامات پر جمع کرنے کا کام، اس کے بعد کھانے کی تیاری میں اناج کی پسائی، کھانا پکانا، اس کے لئے آگ کو محفوظ رکھنا۔ لہٰذا اس مرحلہ پر کام کی تقسیم شروع ہوئی، اوزار اور ہتھیار بنانے کے لئے، مکانوں کی تعمیر کے لئے، کپڑے کے بُننے کے لئے کاریگروں کا طبقہ وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی بستی کی حفاظت بھی ضروری ٹھہری، کیونکہ خانہ بدوش گروپ یا جتھے گاؤں پر حملہ کر کے اس کے اناج کو لوٹنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس لئے جنگجوؤں کا طبقہ وجود میں آیا کہ جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان حملہ آوروں سے گاؤں کی حفاظت کریں۔ چونکہ بستی کی خوش حالی کا دارومدار زراعت اور اچھی فصل پر تھا، اس لئے پجاریوں کا طبقہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے باعمل ہوا کہ وہ دیوتاؤں کو خوش رکھے گا تا کہ موسم

ٹھیک رہے، ہوا، پانی اور دھوپ سے فصل زرخیز رہے۔ لہٰذا ایسے طبقات کے وجود میں آنے کے بعد سماج میں کام کا مفہوم بدل گیا۔ ایک طبقے میں وہ شامل تھے جو پیداواری عمل میں حصہ لیتے تھے، جیسے کسان اور کاریگر، دوسری طرف وہ طبقے تھے کہ جو ان کی حفاظت کا ذمہ لیتے تھے یہ ہتھیار بند تھے، اور فوجی طاقت رکھتے تھے، دوسری طرف پجاری تھے کہ جو دیوی، دیوتاؤں کے قریب تھے اور انہیں خوش رکھ کر فصلوں کی پیداوار کو محفوظ رکھتے تھے، اگر چہ ان دو طبقوں کے پاس جو کام کی نوعیت تھی اس میں یہ پیداوار میں شریک نہیں ہوتے تھے، اور اپنا حصہ لیتے تھے۔ سماج میں ان کی اہمیت اس لئے ہو گئی تھی کہ ان کے پاس فوجی اور روحانی طاقت تھی۔ جبکہ دوسرے طبقے اس طاقت سے محروم تھے اور مجبور تھے کہ اپنی اور فصلوں کی حفاظت کے لئے، اپنی پیداوار کا ایک حصہ انہیں دیں۔

کام کے معنی اور مفہوم میں اس وقت اور تبدیلی آئی کہ جب غلامی کا رواج ہوا، یہ غلام جنگی قیدی بھی ہوتے تھے اور وہ لوگ بھی کہ جو غربت کی حالت میں اپنے بچوں کو فروخت کر دیتے تھے، یا خود جاگیردار یا سردار کا قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں غلام بنا لئے جاتے تھے۔ چونکہ یہ غلام مالک کی ملکیت ہوتے تھے اس لئے ان سے ہر قسم کا کام لیا جاتا تھا، خصوصیت سے محنت ومشقت یا نچلے درجہ کے کام کہ جو کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا تھا جیسے گندگی کی صفائی، اب یہ کام غلاموں کے ذمہ کر دیئے گئے اس لئے کام کی اہمیت ایک دم گھٹ گئی کیونکہ کام کرنا غلاموں سے منصوب ہونے لگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یونان اور روم میں یہ غلام معدنیات کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ جس کے ماحول اور آلودگی کی وجہ سے یہ جلد ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ گھریلو کام کاج کے لئے بھی غلاموں اور کنیزوں کی ایک بڑی تعداد تھی، جس کی وجہ سے حکمراں طبقہ یا امراء کے لئے کام کرنا، خاص طور سے محنت کے کام کرنا معیوب ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں کہ جہاں غلامی کا ادارہ تو نہیں تھا، مگر یہاں کام کو ذاتوں سے متعلق کر کے، ان کو اس رشتہ میں اس قدر مضبوطی سے جکڑا کہ ان کے لئے اس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ برہمن، کشتری، ویش، شودر کے اور ان چاروں ذاتوں سے باہر اچھوت تھے کہ جن کے ذمہ گندگی و غلاظت اٹھانے کا کام تھا۔ ان کو شہروں میں رہنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ان کی بستیاں شہروں سے باہر ہوا کرتی تھیں۔ سماج میں نہ تو ان کی عزت تھی اور نہ ہی ان کے کام کی۔ اگر چہ اکبر نے ان کے کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انہیں حلال خور کہا، اور گاندھی جی نے ہریجن کا نام دیا، مگر محض نام

دینے سے نہ تو ان کے کام کی اہمیت ہوئی اور نہ ہی سماج میں ان کا درجہ بڑھا۔ جب ہندوستان میں ترکوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے نتیجہ میں تبدیلی یہ آئی کہ ترک اپنے ہمراہ نئی ٹیکنالوجی لے کر آئے، جس میں خاص طور سے کاغذ بنانے کا فن اور کپڑے کی صنعت میں تبدیلی تھی، اس کے لئے آب پاشی میں جو نئی تکنیک آئی، اس سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا، اس نئی ٹیکنالوجی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاریگروں کے طبقے کے سماجی رتبہ میں بھی تبدیلی آئی، اوران کی معاشی حالت بہتر ہوئی۔ ذات پات کا وہ سخت نظام جو اس سے پہلے تھا وہ کمزور ہوا، برہمنوں کی شاہی سرپرستی ختم ہوئی، تو انہوں نے اپنی مالی مشکلات کا حل ملازمت کرنے میں ڈھونڈا، جب ترکوں کی فوج تمام ذاتوں کے لئے کھول دی گئی تو کشتریوں کی بالا دستی ختم ہوگئی۔

نئے حکمرانوں کو اپنی سلطنت کے استحکام اور اپنی حکمرانی کے لئے نئے ساز وسامان کی ضرورت تھی اس لئے لوہاروں نے ہتھیار اور اوزار بنانے کا کام کیا، تو جولاہوں نے لباس کی تیاری کے لئے نئے طرز کے کپڑے تیار کرنے شروع کئے، درزیوں نے خلعتوں اور لباس فاخرہ کی تیاری کے لئے فیشن کے نئے انداز اختیار کئے۔

سناروں نے زیورات کی تیاری میں اپنے فن اور ہنر کا اظہار کیا، معماروں نے نئی طرز کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے نقشے تیار کئے، بڑھئی فرنیچر بنانے کے کام میں اپنی کاریگری دکھانے لگے۔

لہٰذا اس مرحلہ پر ہنرمند اور فنی ماہرین کے کاموں کی ابتداء ہوئی کہ جس میں کاریگروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ اس مرحلہ پر کچھ پیشے ایسے تھے کہ جو سماجی طور پر کم تر رہے، وہ قصائی، موچی یا مزدور کہ جن کا کام سامان اُٹھانا، پالکیوں میں سواریوں کو لے جانا، یا اسی قسم کے محنت کے کام تھے۔ ان کے کاموں کو معاشرے میں کم تر تسلیم کیا گیا، اور انہیں معاشرے میں عزت واحترام کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔

زراعتی معاشرے میں اگرچہ سب سے زیادہ احترام کا مستحق کسان کو ہونا چاہئے، مگر اس کے کام کی بھی اسے وہ عزت نہیں ملی کہ جس کا وہ مستحق تھا۔ مویشیوں کو پالنے والے چرواہے بھی کام کی عزت سے باہر رہے۔

عہد سلطنت میں جب پیشہ ور کاریگروں کی معاشی حالت بہتر ہوئی تو اس سے اشرافیہ کو سب

سے زیادہ دکھ تھا، وہ ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور ان کی خوش حالی سے غم وغصہ کی حالت میں تھے۔ اس کا اندازہ اس عہد کے مورخ ضیاءالدین برنی کی تحریروں سے ہوتا ہے، جو اس کی کتب تاریخ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری میں ہیں۔ وہ اس کا سخت مخالف ہے کہ کم ذات اور کمیوں کو معاشرے میں عزت و احترام کا مرتبہ دیا جائے۔ اس کے مطابق اگر یہ لوگ چاہے ذہانت اور لیاقت میں کتنے ہی باصلاحیت کیوں نہ ہوں، انہیں ان کے کم تر درجہ پر رکھا جائے، اور کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں کیا جائے۔

بقول اس کے اگر کتوں اور سوءروں کے گلے میں سونے چاندی اور جواہرات کے طوق پہنا دیئے جائیں تو ان سے ان کی صورت اور ہیئت نہیں بدل جائے گی۔ اسی طرح کم ذات، کم اصل، اور کمین اپنی جگہ کم تر رہتا ہے۔ وہ دولت اور علم سے اپنے سماجی مرتبہ کو نہیں بڑھا سکتا ہے۔

کام سے حقارت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کچھ علماء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لکھنا نہیں جانتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک لکھنے کا کام کاتبوں اور خطاطوں کا تھا۔ وہ اِملا کراتے تھے اور اپنی تحریر کی تصدیق کے لئے اپنی مہر ثبت کر دیتے تھے۔

جاگیردارانہ کلچر میں کام کرنا باعث تحقیر ہو گیا تھا۔ اس لئے مرزا غالب نے دلی کالج کی پروفیسرشپ کو اپنے لئے قابل احترام نہیں گردانا، اور پنشن یا وظیفہ کے لئے درخواستیں دیتے رہے اور حکمرانوں کی شان میں قصیدے لکھتے رہے۔ ان کے ذہن کی عکاسی اس شعر سے ہوتی ہے۔ ؎

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بیکار بیٹھے ہیں

جاگیردارانہ کلچر میں اس لئے کام کی اہمیت گھٹ گئی، بادشاہ اور امراء کی خدمت کے لئے لاتعداد ملازموں اور خدمت گاروں کی فوج ہوتی تھی کہ جو ان کے احکامات کے لئے تیار رہتے تھے، اور ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت بجالاتے تھے۔ بزم آخر کے مصنف نے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ان کے مصاحبوں، درباریوں اور خدمت گاروں کی ایک طویل فہرست دی ہے جن میں باورچی، فراش، حقہ رکھنے والے، پانی پلانے والے، خوشبو، لباس اور خلعت کے نگہبان، شاعر، داستان گو، اور محافظ، یہی حال امراء کا تھا کہ جن کی حویلیوں میں خدمت گاروں کی ایک فوج ہوا کرتی تھی، جب یہ باہر جلوس کی شکل میں جاتے تھے تو ان کے ساتھ محافظوں کے علاوہ نوکروں کی

فوج بھی ہوتی تھی، ایک مغل امیر تو یہ بھی گوارانہیں کرتے تھے کہ جلوس کے وقت ان کی سواری سے کوئی پرندہ بھی گذرے، اس لئے غلیل رکھنے والوں کا ایک دستہ ہوتا تھا جو اڑتے پرندوں کو مار گراتا تھا۔ امراء کے محلات میں حرم کی نگہبانی کے لئے خواجہ سراؤں کے علاوہ کنیزوں کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ سب ملازمین اور خدمت گذار وہ ہوتے تھے کہ جو پیداوار کے عمل میں حصہ نہیں لیتے تھے، بلکہ جو ٹیکسوں کے ذریعہ آمدنی ہوتی تھی، اس میں یہ شریک ہوتے تھے، اور اپنے غیر پیداواری عمل سے اس میں حصہ بٹاتے تھے۔ جب ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی تو انگریز افسروں نے بھی اس کلچر کو اختیار کر لیا۔ ایک فوجی کیپٹن کی خدمت کے لئے 15 سے 20 ملازمین ہوتے تھے، جن میں دھوبی، سائیس، مالی، باورچی، پنکھے کو جھلنے والا، ہرکارہ، چوکیدار اور صفائی کرنے والا۔ ہندوستان کے وائسرائے کے لاج میں تین ہزار کی تعداد میں ملازم ہوتے تھے، جو اس کے لاج کے لئے مخصوص تھے۔

لہٰذا اس صورت میں ہاتھ سے کام کرنا، یا محنت و مشقت کے کاموں سے وابستہ کرنا، معاشرے کے نچلے ذات کے لوگوں سے وابستہ ہو گیا تھا، امراء اور اشراف کے لئے کام کرنا باعث ذلت تھا، اسی سے کمی یا کمین کے الفاظ نکلے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے جاگیرداروں کا معاشرے میں کام کرنا کس قدر باعث تحقیر تھا۔

موجودہ معاشرہ چونکہ جاگیردارانہ کلچر کی گرفت میں ہے اس لئے یہاں کام کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اس کلچر میں جاگیردار کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جن کے پاس دولت ہے، اور جاگیردارانہ کلچر کو اپنا لیا ہے، کیونکہ بیروزگاری کی وجہ سے آبادی بہت ہے، ملازم سستے مل جاتے ہیں، اس لئے خود سے کام کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ زندگی میں اکثر ہم یہ منظر دیکھتے ہیں کہ صاحب آگے جا رہا ہے اور اس کا سامان اٹھائے ملازم اس کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ ریلوے اور ائیرپورٹ پر قلیوں کی بڑی تعداد منتظر رہتی ہے کہ وہ مسافروں کا سامان اٹھائیں۔ افسر حضرات کے بستے، تھیلے اور ان کا آفس کا سامان بھی قاصد اور نائب قاصد ان کی گاڑی سے اتار کر آفس میں پہنچاتے ہیں، ایسا سامان لے کر آفس جانا ان کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔ آج بھی جاگیرداروں کی حویلیوں کی ڈیوڑھیوں پر ان کے ملازمین جمع رہتے ہیں، کہ نہ جانے کب سائیں کو ان کی ضرورت پڑ جائے۔

کام کے مفہوم میں اس وقت تبدیلی آئی، جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا، اس کی وجہ سے جاگیردارانہ کلچر کا خاتمہ ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ صنعتی کلچر نے لینا شروع کی۔ صنعتی کلچر میں فیکٹریوں کے نظام نے مزدوروں کے ساتھ ساتھ پیشہ ورلوگوں کے طبقات کو بھی پیدا کیا، جن میں اکاؤنٹنٹ، منیجر اور معاونین تھے۔ فیکٹری کا نظام ایک خاص سسٹم کے ذریعہ چلتا تھا، اس میں ماہرین بھی ہوتے تھے اور وہ مزدور بھی کہ جو کسی فن کے ماہر تھے، اس نے آگے چل کر وائٹ کالر اور بلیو کالر کے ذریعہ تفریق پیدا کی۔

مشینوں کے استعمال کی وجہ سے مزدوروں کے لئے یہ لازمی ٹھہرا کہ وہ اتنے تعلیم یافتہ ضرور ہوں کہ ان مشینوں پر کام کر سکیں، اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ادارے قائم ہوئے، اس کے ساتھ ہی ریاست نے اس کو بھی محسوس کیا کہ ایک صحت مند مزدور زیادہ توانائی کے ساتھ کام کر سکتا ہے، اس لئے صحت کے قوانین اور ماحول کی صفائی پر توجہ دی گئی۔

فیکٹریوں سے باہر دکانوں پر کہ جہاں مال فروخت ہوتا تھا اس کی بھی نئے سرے سے ڈیزائننگ کی گئی، سیلز مین کے ساتھ سیلز گرلز آئیں، گاہکوں کے ساتھ پیش آنے کے رویے مقرر ہوئے اور اس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں وقت کی قدر و اہمیت اور کام کی ضرورت کو معاشرے میں ایک اہم مقام ملا، اور اس کے بارے میں کہا جانے لگا کہ کام عبادت ہے۔ صنعتی معاشرے میں اب خاندانی مرتبہ یا قبیلہ کے اعزاز کی بات نہیں رہی، بلکہ عزت و احترام کا پیمانہ فرد کا کام ہو گیا، اب سفارش کے بجائے، میرٹ کی بنیاد پر اس کی ترقی ہونے لگی، اور اس کا معاشرے میں باعزت و قابل احترام مقام اسے ملتا چلا گیا۔

پاکستانی معاشرے میں چونکہ اب تک جاگیردارانہ کلچر ہے، اس لئے یہاں کام کے بجائے، اب بھی فرد کو اس کے خاندان اور سماجی رشتوں کی بنیاد پر دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس ماحول میں کام کرنے والے ان کے مزارعے اور خادم ہو جاتے ہیں، اس لئے جب تک یہ کلچرل رویئے نہیں بدلیں گے، ہمارے معاشرے میں کام کو عبادت کا درجہ نہیں ملے گا، اور کام کرنے والے کی عزت و احترام نہیں ہوگا۔

تاریخ ایک وحشت ناک خواب ہے

تاریخ کے بارے میں یہ جملہ جیمس جوائس نے اپنے ناول جولیسس میں لکھا ہے۔ کیا واقعی تاریخ کا مطالعہ انسان کو وحشت میں مبتلا کر دیتا ہے، اور اسے جنون کی حالت میں گرفتار کر دیتا ہے۔ اگر تاریخ کو حکمرانوں کے حوالے سے پڑھا جائے تو یقیناً اس میں ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اقتدار میں آنے کی سازش، تخت و تاج کے دعویداروں کا بے رحمی سے قتل، جنگیں کہ جن کے ذریعہ حکمران اپنے اقتدار، شان و شوکت کے علاقہ کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ میدانِ جنگ میں لاشوں کے ڈھیر، اور ان پر فتح کے جشن، مذہبی اور نسلی تعصب اور نفرت کا یہ عالم کہ قتل و غارتگری مسرت کا باعث بن جائے۔ مثلاً جب عباسیوں نے امیہ خاندان کا تختہ الٹا تو ان کی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا۔ منگولوں میں یہ دستور تھا کہ جنگ کے بعد دشمن کی کھوپڑیوں کے مینار بناتے تھے۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ دشمن کے سر کی کھوپڑی کو پیالہ بنا کر اس میں شراب پیتے تھے۔ تاریخ انسان کی ان تمام سفاکیوں کو محفوظ رکھتی ہے، ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں، مگر انسان کا ذہن بدلتا نہیں ہے، وہ اس سلسلہ کو جاری رکھتا ہے۔

بیسویں صدی میں جو قتل عام ہوئے، فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات میں لوگ مارے گئے، ان سب کا تخمینہ ایک مورّخ کے نزدیک یہ ہے کہ ان واقعات کے نتیجے میں 35 ہزار ملیون لوگ مارے گئے۔ جب کہ ریاستی اور حکومتی جنگ میں مارے جانے والے لوگوں کی تعداد 61 ہزار ملیون ہے۔ ابھی اس عہد کی شروعات ہیں کہ قتل و غارتگری کے واقعات ہر خطہ میں جاری ہیں۔

بیسویں صدی کے قتل عام اور فسادات کا ایک المیہ یہ ہے کہ اس میں ٹیکنالوجی کا استعمال ہوا ہے۔ جب راوندا میں ہوتو قبائل کے لوگوں نے تتسی لوگوں کے قتل کا منصوبہ بنایا تو اس میں ہوتو

قبیلہ کے برسرِ اقتدار حکومت نے پورا پورا تعاون کیا۔ تتسی قبیلہ کے افراد کے پتے اور ان کی رہائش گاہوں کی نشان دہی کی۔ یہاں تک ہوا کہ جب ہوتو قبیلہ کے لوگ قتل کی مہم پر تھے تو ان کے ایک ہاتھ میں ریڈیو تھا، جس پر تتسی قبیلہ کے علاقہ کے بارے میں بتایا جا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں بندوق جس سے مخالف قبیلہ کے لوگوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

اس موقع پر عیسائی مذہب کی رفاقت بھی کام نہیں آئی، جب تتسی قبیلہ کے لوگوں نے ہوتو چرچ کے عہدیداروں سے پناہ کی درخواست کی تو اس کا جواب تھا کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تمہیں مرنا ہے، اس لئے مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جب یہ قتل عام ہو رہا تھا، دنیا خاموشی سے اس خوں ریزی کو دیکھ رہی تھی، جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو عالمی کمیشن برائے انسانی جرائم کا اجلاس ہوا اور مقدمات شروع ہوئے، اور یہی کچھ گجرات میں ہوا کہ جہاں کا وزیراعلیٰ نریندر مودی تھا، اس کی حکومت نے بھی مسلمان شہریوں کی فہرست فسادیوں کو مہیا کی، اور ان کے بارے میں پوری پوری اطلاعات دیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ یوگوسلاویہ کے سلاؤ نسل کے لوگوں نے بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور عورتوں کی عصمت دری کی، یہ سب کچھ یورپ میں ہوا، جو کہ تہذیب اور انسانیت کا گڑھ ہے۔ اسرائیل اپنے قیام کے بعد سے فلسطینیوں کے قتل میں اور بے گھر کرنے میں مصروف ہے۔

دیر یاسین کے گاؤں میں فلسطینی عورتوں، بچوں اور مردوں کا قتل عام کیا گیا تاکہ دوسرے گاؤں کے لوگ دہشت زدہ ہو کر چلے جائیں اور ایسا ہوا بھی۔ 1982ء میں لبنان میں ان کے کیمپ صابرہ اور شتیلہ میں عورتوں و بچوں کو قتل کیا گیا، مگر اہل یورپ اسرائیل کے ہر جرم کو معاف کرنے پر تیار ہیں۔

پاکستان میں مذہبی، فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات میں لوگ مارے جاتے ہیں، اور سوائے مذمت کے ان کا کوئی مداوا نہیں کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں جو قتل عام اور غارت گری ہوئی تھی، وہ اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔

تاریخ ان واقعات کو محفوظ کر رہی ہے، ان کے پس منظر میں ہونے والی جارحیت کی بھی نشان دہی کی جا رہی ہے، مگر تمام اداروں کی کوششوں کے باوجود سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟

کیا حکمرانوں اور صاحب اقتدار لوگوں کے مفادات ان کو روکنے میں آڑے آتے ہیں؟ کیا انسان میں رحم اور رواداری کے جذبات ختم ہو گئے ہیں، اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم جس کو ترقی کہتے ہیں کیا واقعی وہ ترقی ہے؟ کیا اس ترقی کے باوجود جب ہم انسان کی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکے، اس کی نفرت اور تعصب کا خاتمہ نہیں کر سکے، تو پھر اس سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا کیا فائدہ؟ ایک لحاظ سے یہ قتل عام کو اور زیادہ موثر بنا رہی ہے اور یہ خوں ریزی کو ابھار رہی ہے۔ کیا انسان کی جو خواہش ہے وہ کبھی پوری ہوگی، یا وہ محض اس کے خواب دیکھتا رہے گا، جبکہ ہزارہا لوگ اپنی جوانی میں زندگی سے محروم ہوتے رہیں گے۔ امن و انصاف کی آواز اُٹھانے والے نظر انداز ہوتے رہیں گے۔ ان کی آوازیں بے ہنگم شور و غل میں اور مرتے انسانوں کی چیخوں میں ضم ہوتی رہیں گی، اور تاریخ ایک وحشت ناک خواب کی مانند خوف زدہ کرتی رہے گی۔

اذیت دینا

تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہم جہاں ایک طرف انسانی حقوق، سزائے موت کے خاتمہ اور فرد کے بنیادی حقوق کی بات کرتے ہیں وہیں ہمیں دوسری جانب ریاست، جماعت اور افراد اپنے مخالفوں کو اذیت دینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان میں حریفوں، مجرموں، ذاتی وفرقہ وارانہ اور نسلی دشمنوں، مذہب سے منحرف لوگوں، وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے، اور جب ان پر قابو پایا جاتا ہے تو ان کو اذیت دے کر ان سے گناہوں، جرائم اور ملک وقوم سے دشمنی کا اعتراف کرایا جاتا ہے۔

جو لوگ اذیت دیتے ہیں، ان میں سے ایک تو وہ ہوتے ہیں کہ جنہیں ریاست کی جانب سے یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ حریفوں اور مخالفوں کو اذیت دے کر ان سے اعترافِ جرم حاصل کریں، اور پھر اس کے بعد انہیں ان کے جرائم کی سزا دی جائے، دوسری جانب وہ جماعتیں، فرقے اور افراد ہیں کہ جو اپنے مخالفوں کو پکڑ کر ان سے انتقام لیتے ہیں، اور دہشت کے ذریعہ اپنے تسلط کو قائم کرتے ہیں۔

اس مرحلہ پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ افراد جو اذیت دینے پر مامور ہوتے ہیں، معاشرے کے دوسرے لوگوں کی طرح ہی ہوتے ہیں، یہ گھر بار اور خاندان والے ہوتے ہیں، اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتے ہیں، دوستوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کی طرح معمول کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ جب یہ لوگوں کو اذیت دیتے ہیں، تو اذیت پانے والے افراد کے دکھ، درد، ان کی اذیت، ان کی چیخ و پکار اور ان کے چہروں سے عیاں ہونے والی بے بسی خود محسوس نہیں کرتے ہیں، اور اذیت دیتے وقت بے رحم، سنگدل، شقی القلب اور ظالم کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، اور جب وہ اس عمل سے فارغ ہوتے ہیں تو عام لوگوں کی طرح

جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہیں۔

اذیت دینے والوں کی جس انداز میں تربیت کی جاتی ہے، اس میں اول تو ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ وہ جن لوگوں کو اذیت دے رہے ہیں یہ لوگ مجرم اور دشمن ہیں، لہٰذا ان کو غیر انسانی بنا کر ان کا درجہ گھٹا دیا جاتا ہے۔ جب ذہن میں یہ ہو کہ یہ لوگ ملک وقوم اور معاشرے یا مذہب کے لئے انتہائی خطرناک ہیں، تو پھر ان کے لئے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تا کہ ملک وقوم، سماج، اور مذہب محفوظ ہو جائیں، یا ان کو اذیت دے کر مجبور کیا جائے کہ وہ واپس معاشرے کی روایات میں آ جائیں اور اپنے گناہوں اور نظریات سے توبہ کر لیں۔

اس کے بعد اذیت دینے والے کو اس بات کی مسرت ہوتی ہے کہ وہ اتھارٹی کا مالک ہے، اور دوسرا انسان اس کے رحم و کرم پر ہے۔ بڑائی کا جذبہ اور دوسروں کو کم تر سمجھنا، یہ فرد کے جذبات کو تسکین دیتا ہے۔ وہ اس پر خوشی محسوس کرتا ہے کہ اس کی اتھارٹی کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہے۔ وہ اذیت دیتے وقت اپنی ذات کو بالا و برتر سمجھتا ہے، اور دوسرے کی بے بسی اسے مسرت کا احساس دیتی ہے۔

اذیت دینے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسرے مخالفوں کو وارننگ دی دی جائے اور ان میں ڈر اور خوف کو پیدا کر دیا جائے، تا کہ کسی میں مخالفت کرنے کی جرات و ہمت نہ رہے۔ اس لئے اذیت کے ذریعہ وہ افراد کو عبرت کا نشانہ بنا کر اپنی اتھارٹی کو مضبوط کرتے ہیں۔

ابتداء میں ریاست کی جانب سے جو سزائیں، اور اذیتیں دی جاتی تھیں، وہ پبلک مقامات پر ہوتی تھیں تا کہ لوگ ان کا مشاہدہ کریں۔ ریاست کی جانب سے اذیت دینے والے کو قانونی تحفظ حاصل ہوتا تھا، آج بھی یہ تحفظ اسے دیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر یہ اذیتیں بے گناہ یا سیاسی حریفوں کو دی جائیں تو یہ غیر انسانی اور غیر قانونی ہیں، مگر ریاست یا کسی ادارے کی جانب سے ان پر مقدمہ نہیں چلایا جاتا ہے۔ مثلاً جب ہٹلر کے زمانے میں، جن عہدے داروں نے یہ اذیتیں اور سزائیں دی تھیں، نازی حکومت کے خاتمہ کے بعد ان کا استدلال یہی تھا کہ وہ حکومت کے ملازم ہونے کی حیثیت سے ان احکامات کے پابند تھے۔ اگر وہ ان کی خلاف ورزی کرتے تو انہیں سزا بھگتنی پڑتی۔ اس لئے یہ سوال اہم ہے کہ کیا حکومت یا ریاست کے ان غیر قانونی احکامات پر عمل

کرنا چاہئے یا ان سے انکار کرنا چاہئے؟ اسرائیل کی حکومت میں وہاں کی عدالت نے فلسطینیوں کو اذیت دینے کو قانونی حیثیت دیدی ہے۔ اس لئے اس کے عہدیداروں کو اب ان پر عمل کرنا آسان ہو گیا ہے۔

پبلک مقامات پر جو سزائیں دی جاتی تھیں، وہ اکثر بڑی بے رحمانہ ہوتی تھیں مثلاً رومیوں کے ہاں عام مجرموں کو اور باغیوں کو مصلوب کیا جاتا تھا، جیسے اسپارٹکس میں بغاوت کے خاتمہ کے بعد بیس ہزار غلاموں کو مصلوب کیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو بھی عام مجرموں کی طرح مصلوب کیا گیا، کیونکہ رومی سرداروں کو یا تو قتل کیا جاتا تھا یا انہیں خودکشی کے لئے کہا جاتا تھا۔ رومی شہنشاہ نیرو نے اپنے استاد سینکا کو خودکشی پر مجبور کیا اور اپنی ماں کو قتل کر دیا۔

یہ بھی دستور تھا کہ باغیوں یا حریفوں اور مجرموں کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے جاتے تھے۔ انہیں ایک بڑے پہیہ سے باندھ کر اسے گھمایا جاتا تھا، جس سے اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتی تھیں۔ ایک اور سزا کا طریقہ یہ تھا کہ اس کے ہاتھوں کو دو جانب باندھ کر رَسّی کو گھوڑوں سے منسلک کر دیا جاتا تھا پھر دونوں جانب سے گھوڑوں کو دوڑا دیا جاتا تھا جس سے اس کے بازو جسم سے علیحدہ ہو جاتے تھے۔ ایک اور طریقہ پلروں (Pillory) کہلاتا تھا، اس میں اس کے ہاتھوں کو تختہ سے باندھ کر اس کے چہرہ کو کھلا رکھا جاتا تھا، تاکہ آنے وجانے والے لوگ اس پر تھوکیں۔ اس اذیت کے بعد اسے پھانسی دیدی جاتی تھی۔ اگر کسی کو بغیر اذیت کے پھانسی دیدی جائے تو یہ رحم دلی کی مثال ہوتی تھی۔

عہد وسطیٰ میں عیسائی چرچ نے انکوئی زیشن کا محکمہ قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ عیسائی کہ جو مذہب سے منحرف ہو گئے تھے، یا جو ایسے فرقوں میں شامل ہو گئے تھے کہ جو چرچ کی تعلیمات سے مختلف تھے تو ان پر مقدمہ چلایا جاتا تھا، ان افراد کو اول اذیت دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے اذیت کے آلات اور مشینیں تھیں کہ جو تکلیف دہ اذیت دیتی تھیں۔ گلیلیو نے انہی اذیت کی مشینوں کو دیکھ کر یہ اعتراف کر لیا تھا کہ دنیا گول نہیں ہے۔ اس اذیت دینے کا مقصد یہ تھا کہ یہ افراد ایسے گناہوں کا اعتراف کر لیں، اعتراف کرنے کی صورت میں، اور انکار کے بعد، ان کو اذیت کے بعد ریاست کے عہدے داروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو انہیں پبلک مقام پر باندھ کر جلا دیتے تھے۔

چرچ کے یہ عہدیدار اذیت دیتے وقت کسی قسم کی اخلاقی یا انسانی ہمدردی سے دور رہتے تھے، بلکہ وہ اس کو بطور ثواب سمجھتے تھے۔ اذیت دینے کو روکنے اور انسانی حقوق کے قوانین کے باوجود اذیتیں دینے کا رواج آج بھی جاری ہے۔ امریکہ نے ویت نام اور عراق میں مختلف طریقوں سے اذیتیں دیں اور ان پر کسی قسم کی ندامت کا اظہار نہیں کیا۔ اسرائیل فلسطینیوں پر مسلسل اذیت کے مظالم ڈھار ہا ہے اور دنیا اس پر خاموش ہے۔

آمر اور مطلق العنان حکمران اپنے سیاسی حریفوں کو اذیتیں دیتے ہیں اور عالمی قوانین کی پرواہ نہیں کرتے ہیں، پاکستان میں پولیس کے تھانے مجرموں کو اذیت دے کر مار ڈالتے ہیں مگر قانون کی پہنچ سے دور رہتے ہیں۔ سیاسی مخالفین کو اذیت دینے کے ہزار ہا واقعات سامنے آچکے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی مزاحمت ختم کر کے ان کو ریاست کا تابع اور فرماں بردار بنا دیا جائے۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سلسلہ اسی طرح سے جاری رہے گا اور افراد اپنے نظریات، عقائد اور افکار کی بنیاد پر اذیت کا شکار ہوتے رہیں گے؟ کیا اپنے مخالفین سے نفرت اور تعصب کے جذبات اس قدر گہرے رہیں گے کہ ان کو جسمانی اذیت دے کر، ان کے مخالفین اس سے خوشی و مسرت حاصل کرتے رہیں گے؟ کیا انسانی ہمدردی اور رحم کے جذبات اسی طرح سے مصلوب ہوتے رہیں گے؟ اور کیا طاقت وقوت کے سہارے اسی طرح سے انسان کو ذلیل و حقیر کر کے ان کو جسمانی طور پر ناکارہ اور معذور بنایا جاتا رہے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔

مرد کی بالادستی کی ابتداء

عورت اور مرد کے سماجی تعلقات کے بارے میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ قدرت نے مرد کو افضل اور برتر بنایا ہے جب کہ عورت کم تر اور مرد کی زیردست ہے۔ یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوتی ہے کیونکہ ہم تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ سماج کی تشکیل فطری یا نیچرل ہے۔ امیر و غریب کے درمیان فرق کو بھی ہم فطری سمجھتے ہیں، لیکن اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سماجی روایات، قدریں، ادارے اور رویے نیچرل نہیں ہوتے ہیں، یہ سماج کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے کوئی روایت یا ادارہ اپنی جگہ آفاقی یا ابدی نہیں ہے، یہ برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے، یہی صورت حال عورت اور مرد کے سماجی رشتوں کی ہے۔

تاریخ کے ابتدائی زمانے میں جس کو غذا جمع کرنے اور شکار کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس وقت عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں تھا، دونوں ہی مل کر غذا کا حصول کرتے تھے، یہ ضروری تھا کہ عورتیں اور بچے پھل، سبزیاں اور درختوں کی جڑوں کو جمع کرتے تھے جب کہ مرد شکار کر کے غذا کا انتظام کرتے تھے، مگر محنت کی یہ تقسیم کوئی اصولی نہیں تھی، عورتیں بھی جب موقع ملتا ساتھ شکار کرنے میں حصہ لیتی تھیں اور مرد پھل اور سبزیاں اکٹھی کرتے تھے۔

اس صورت حال میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب انسان نے کھیتی باڑی شروع کی اور بستی میں رہنا شروع کیا۔ کھیتی باڑی میں سخت محنت درکار تھی، کیونکہ زمین کو پتھر کے اوزاروں سے کھودنا، بیج ڈالنا، آب پاشی کے ذرائع کو استعمال کرنا، اور پھر فصل کی نگہداشت، اس وجہ سے مرد اور عورت کے درمیان کام کی تقسیم ہوئی، عورت نے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالیں، تاکہ کھانے پکانے کا انتظام کرے لہٰذا اناج کو چکّی میں پیسنا، روٹی تیار کرنا، اور پھر بچوں کی پرورش، اس نے عورت کو گھریلو

کاموں میں اس قدر اُلجھا دیا کہ اس کے پاس فرصت کے لمحات ختم ہو گئے، ساتھ ہی میں یہ بھی عورت کی ذمہ داری ہوگئی کہ جانوروں کی دیکھ بھال کرے۔ اس کے علاوہ کاشت کاری کے عہد میں اس بات کی ضرورت تھی کہ زیادہ سے زیادہ بچے ہوں تا کہ وہ کھیتی باڑی میں مدد کر سکیں، اب عورت بچے پیدا کرنے اور ان کی پرورش میں مصروف ہوگئی۔

گھریلو کام کاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا تعلق باہر کی دنیا سے کٹ گیا، باہر کی دنیا مرد کی ہوگئی اور عورت گھر کی چار دیواری میں بند ہوگئی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ مرد یہ سمجھنے لگا کہ چونکہ وہ باہر جاتا ہے اور کھیتی باڑی کرتا ہے، لہٰذا اس کا کام اہمیت کا ہے، وہ پیداوار سے جڑا ہوا ہے، جب کہ عورت گھر میں رہتی ہے، اور پیداواری عمل میں اس کا حصہ نہیں ہے، اس نے عورت کے کام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور اپنے کام کو اہمیت دے کر اس نے خود کو افضل اور بالاتر سمجھنا شروع کر دیا۔

بقول اینگلز عورت کا سماجی درجہ اس وقت اور گرا کہ جب سماج میں نجی جائیداد کا ادارہ وجود میں آیا۔ اب عورت کی یہ ذمہ داری ٹھہری کہ وہ جائیداد کا وارث بھی پیدا کرے، چونکہ جائیداد کے وارث کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس کے شوہر کی اولاد ہو، اس لئے عورت پر مزید پابندیاں عائد کی گئیں، اور اس کی عصمت وعفت پر زور دیا گیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے تہذیب کا ارتقاء ہوتا گیا، اسی طرح سے عورت پابندیوں کا شکار ہوتی چلی گئی، مثلاً قدیم تہذیبوں میں عورت پر پابندی تھی کہ وہ سماجی سرگرمیوں میں حصہ نہ لے، مثلاً قدیم یونان میں عورتوں کو ووٹ کا حق نہیں تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل کر مارکیٹ میں جا کر خرید وفروخت نہیں کر سکتی تھیں، اگر مرد گھر پر موجود نہ ہو تو کسی آنے والے کو جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ گھر میں اس کے لئے زنانہ حصہ مخصوص تھا، باہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عورت کا سماجی رتبہ گھٹا کر اسے ایک شے بنا دیا، جس کی وجہ سے وہ مرد کی ملکیت بن کر رہ گئی۔ بادشاہوں اور امراء نے بڑی تعداد میں عورتوں کو اس طرح جمع کرنا شروع کر دیا [جیسے ہیرے جواہرات یا قیمتی اشیاء]۔ عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھا جاتا تھا اور شکست خوردہ قوموں کی عورتوں کو بطور کنیز لوٹ کر لے جایا جاتا تھا۔

عورت کی یہ سماجی حیثیت دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں موجود ہے، کیونکہ اس وقت تک پدرسری کا معاشرہ مستحکم ہو چکا تھا، اس لئے ان مذاہب میں مرد کی بالادستی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اسی طرح تاریخ نویسی بھی اس نظر سے متاثر ہوئی، اور تاریخ کا مرکز مرد کی ذات بن گیا۔ یہ تاریخ ایک طرح سے مردانہ تاریخ ہے، جس میں سے عورتیں غائب ہیں، یا ان کا ذکر ہے تو ان کی حیثیت مرد کے تابع ہے۔ عورت کے اس سماجی نظریہ نے زبان کو بھی متاثر کیا، ایسے استعارات استعمال کئے کہ جن میں عورت کی ذات کو کم تر بتایا گیا ہے اور اس کو مرد کا غلام بنا دیا گیا ہے۔ یہی صورت حال قدیم اور عہد وسطیٰ کی مصوری اور مجسمہ سازی میں نظر آتی ہے جن میں یا تو عورت غائب ہے یا اس کو کم تر حیثیت کے طور پر دیکھایا گیا ہے۔ اس لئے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ یہ تصورات اور نظریات وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ

یونان کے مشہور فلسفی دیو جانس کلبی کا واقعہ تاریخ میں مشہور ہے کہ جب سکندر اس کی شہرت سن کر اس سے ملنے کے لئے پہنچا تو وہ سردی کے موسم میں بڑے سکون اور آرام سے ناند میں لیٹا ہوا دھوپ سینک رہا تھا، سکندر معہ اپنے لاؤ لشکر اور مصاحبوں کے ساتھ اس کے پاس پہنچا، دیو جانس اس کی آمد پر نہ تو حیران ہوا اور نہ پریشان بلکہ اسی طرح سے لیٹا رہا۔ سکندر نے قریب پہنچ کر اپنا تعارف کرایا کہ وہ سکندر ہے جس نے یونان کی ریاستوں کو فتح کیا ہے اور میسوڈونیا کا بادشاہ ہے۔ دیو جانس نے یہ سن کر اس کی جانب دیکھا، اور کہنے لگا کہ پھر میں کیا کروں، تمہاری فتوحات سے میرا کیا واسطہ۔

سکندر نے دیکھا کہ یہ شخص اس کی فتوحات سے نہ تو متاثر ہوا، نہ رعب میں آیا، اور نہ پریشان ہوا، بلکہ اسی طرح سے لیٹا رہا، تو اس نے ایک دوسرا حربہ استعمال کیا اور کہنے لگا کہ ''کیا تم مجھ سے خوف زدہ نہیں ہوئے؟''

اس پر فلسفی نے جواب دیا کہ ''کیا تم کوئی برائی ہو، یا شیطان ہو کہ جس سے خوف زدہ ہوا جائے۔'' سکندر کو اس پر تعجب ہوا، تو اس نے تیسرا حربہ استعمال کیا اور کہنے لگا [میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ اس پر اُس نے جواب دیا کہ آپ ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں] اس جواب پر اُس نے کہا کہ اگر سکندر نہیں ہوتا تو دیو جانس ہونا پسند کرتا۔

دیو جانس کا یہ رویہ سکندر کے ساتھ کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق کلبی (Cynicism) کے فلسفہ سے تھا، اس فلسفہ کے ماننے والے ترکِ دنیا کے قائل تھے اور خود کو تمام دنیاوی معاملات سے آزاد رکھنا چاہتے تھے، نہ تو خاندان سے تعلق رکھنا چاہتے تھے، نہ جائیداد اور دنیاوی آسائشوں

کے لئے کوئی جدوجہد کرنا چاہتے تھے۔ان خیالات کی وجہ سے یونان کے لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ ان کی زندگی کتوں کے مانند ہے،اس سے اردو میں ان کے فلسفہ کے لئے کلبیت کی اصطلاح کا رواج ہوا۔

دیوجانس کلبی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ برہنہ رہتا تھا،اس کا گذارا بھیک پر ہوتا تھا، اس لئے اگر مل جاتا تھا تو بھوک دور کر لیتا تھا، ورنہ اس کے لئے مارا مارا نہیں پھرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس مٹی کا ایک پیالہ تھا،جس سے وہ پانی پیا کرتا تھا۔ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا ہاتھ سے چلو میں پانی پی رہا ہے،تو اس نے یہ دیکھ کر اپنا مٹی کا پیالہ توڑ دیا،اور کہنے لگا کہ اس کی کیا ضرورت ہے، پانی پینے کا یہ طریقہ اس لڑکے نے سکھا دیا ہے۔

اس لئے اگر کوئی شخص جس کا نہ تو خاندان ہو، نہ جائیداد، تو ایک ایسا فرد نڈر اور بے خوف ہو جاتا ہے،اس کے لئے اس دنیا میں کھونے کے لئے کچھ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز کہ جس کی حفاظت کی جائے، اس لئے بادشاہوں کے کروفر، امراء کی شان وشوکت، اور دنیاوی آرام و آسائش کی خواہشات اس کے لئے بے معنی ہو جاتی ہیں، تو وہ پھر ایک آزاد شخص کی حیثیت سے اس دنیا میں رہتا ہے اور دنیا سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے لئے فطرت کی خوبصورتی اہم ہو جاتی ہے،اس کی زندگی کا مفہوم دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بدل جاتا ہے۔وہ اس بات کے لئے اپنا وقت اور اپنی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا ہے کہ جائیداد بنا کے، اور اپنے وارثوں کے لئے دولت وآرام کے وسائل چھوڑ جائے۔اس کی زندگی ان تمام باتوں سے بالاتر ہو جاتی ہے، زندگی کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ فطرت سے لطف اُٹھایا جائے، اور سکون واطمینان کو حاصل کیا جائے۔یہی وہ جذبہ تھا کہ وہ سکندر سے مرعوب نہیں ہوا، اور سکندر نے اسے جو پیشکش کی تھی وہ اس کے لئے بے معنی تھی۔

اس کا یہ رویہ عام لوگوں کے لئے یقیناً باعث تعجب ہوگا۔ کیونکہ اس کا ایک سبق ہے کہ اگر انسان دنیاوی خواہشات کو ترک کر دے، یا کم کر دے، تو اس میں اس کی آزادی ہے، اور اس میں وہ اپنی صلاحیتوں کو اُبھار سکتا ہے۔اور یہی وہ جذبہ ہے کہ جو فرد کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھار سکے۔

کلبیت کا فلسفہ اس بات کا اظہار ہے کہ یہ دنیا دکھوں اور تکالیف کی جگہ ہے، یہاں ایک فرد جب اس کے جھمیلوں میں پڑتا ہے تو اس کی ذات اس میں پھنس کر ختم ہو جاتی ہے، اس کی صلاحیتیں جائیداد کے جھگڑوں اور خاندان کے مسائل حل کرنے میں لگ جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا حل یہ ہے کہ وہ ان سب سے نجات پا کے سادہ اور فقر کی زندگی گذارے، اسی صورت میں وہ دنیا کے دکھوں سے نجات پا سکتا ہے۔

خودکشی کرنا

آ جکل اخبارات میں تقریباً روزانہ خودکشی کی خبریں آتی ہیں۔خودکشی کی وجوہات میں لوگوں کی غربت، افلاس اور تنگ دستی کے علاوہ ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں ہیں۔لیکن تاریخ میں لوگ عزت کی خاطر بھی خودکشی کرتے رہے ہیں۔مثلاً قدیم یونان اور روم میں جو فوجی جرنل میدانِ جنگ میں شکست کھا جاتے تھے تو وہ اپنی عزت کی خاطر خودکشی کر لیتے تھے۔یا شکست کھانے کے بعد یا دشمنی کی صورت میں قید سے بچنے کے لئے بھی خودکشی کا رواج تھا۔جیسے یونان میں مشہور خطیب اور سیاستدان ڈیمس تھینیس (Demoes Thenese)۔جس نے میسوڈومیہ کے خلاف مزاحمت کی تھی کہ جس نے ایتھنز کی شہری ریاست پر قبضہ کرلیا تھا۔لہٰذا جب میسوڈومیہ کی فوج اس کو گرفتار کرنے گئی تو پہلے اس نے ایک مندر میں پناہ لی تا کہ فوجی مندر کے تقدس کا خیال کرتے ہوئے اسے گرفتار نہ کریں۔مگر جب ایسا نہیں ہوا تو گرفتاری سے بچنے کے لئے اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔مشہور مورّخ پلوٹارک (Plutarch) نے اس کے اس اقدام کی تعریف کی ہے جبکہ سسرُو (Ciceroe) پر تنقید کی ہے کہ اس نے خودکشی کے بجائے خود کو گرفتار کروایا۔

کارتھیج کے مشہور جرنل ہنی بال (Hanibal) جس نے رومیوں کو کئی جنگوں میں شکست دی لیکن آخر میں زیما (Zema) کی جنگ میں اسے شکست ہوئی، رومی سینٹ چاہتی تھی کہ اُسے گرفتار کر کے روم لایا جائے۔تا کہ اس پر مقدمہ چلایا جا سکے۔آخر میں جب ہنی بال نے دیکھا کہ غداری کے سبب اس کو روم کے حوالے کیا جا رہا ہے تو اس نے بھی یہ کہتے ہوئے زہر آلود گولیاں کھالیں کہ ایک بے بس جرنل کے لئے عزت کا یہ آخری راستہ ہے۔رومی سلطنت میں بھی امراء اور حکمراں عزت کے نام پر خودکشی کرتے رہے تھے۔مثلاً جب سیزر کے قاتلوں کو شکست ہوئی تو بروٹس (Brutus) اور اس کے ساتھیوں نے گرفتاری سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی۔یہی صورتِ

حال انٹونی (Antony) اور قلوپطرہ کو اس وقت پیش آئی جب اُنہیں ایکٹیم (Actium) کی جنگ میں شکست ہوئی۔ دونوں نے گرفتاری کے بجائے خودکشی کر کے موت کو ترجیح دی۔ قلوپطرہ نے اس وجہ سے بھی خودکشی کی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آکٹی وی ین (Octivian) رومی جنگجو اسے قیدی بنا کر فتح کے جلوس میں اس کی نمائش کریں۔

روم کی تاریخ میں خودکشی کی ایک اہم روایت ''سینی کا'' (Senica) کی ہے جو کہ ایک فلسفی اور رومی شہنشاہ ''میرو'' (Mero) کا استاد تھا۔ میرو نے اول اس کو جلاوطن کیا اور بعد میں یہ حکم دیا کہ وہ خودکشی کر لے۔ جب فوجی اس حکم کی تعمیل میں اس کے پاس آئے تو وہ پُرسکون طور پر شطرنج کھیلتا رہا۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے اس نے خودکشی کا یہ طریقہ اپنایا کہ اپنی شہ رگ کو کاٹا جس سے اس کے جسم کا خون آہستہ آہستہ بہتا رہا۔ جب کہ اس دوران وہ دوستوں کے ساتھ فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو کرتا رہا۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہوئی کہ جب میرو کے خلاف اس کے فوجی گارڈ نے بغاوت کی تو اس کے پاس بھی خودکشی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ خودکشی اس نے اس وقت کی کہ جب فوج اس کے قریب پہنچنے والی تھی۔ خودکشی سے قبل اس کے آخری الفاظ یہ تھے کہ دنیا آج ایک بڑے آرٹسٹ سے محروم ہو رہی ہے۔

عزت کے نام پر خودکشی کی رسم جاپان میں سمورائی کلچر کا ایک اہم حصہ تھا۔ یہ رسم آج ''ہراکاری'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں خودکشی کرنے والا اپنے پیٹ میں چاقو یا خنجر مار کر موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ جو افراد اس طرح سے خودکشی کرتے ہیں جاپان میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

خودکشی کی اس قسم کی مثالیں ہمیں چین کی تاریخ میں بھی ملتی ہیں مثلاً منگ (Ming) خاندان کے شہنشاہ کے خلاف جب بغاوت ہوئی اور باغی اس کے محل کا محاصرہ کر کے اندر داخل ہونے والے تھے تو اس موقع پر اس نے شاہی خاندان کے تمام افراد کو قتل کر کے ایک درخت پر پھانسی کا پھندا لگا کر مر گیا۔

افراد کی خودکشیوں کے علاوہ ہمیں تاریخ میں اجتماعی خودکشیوں کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً جب یہودیوں نے فلسطین میں رومیوں کے خلاف بغاوت کی تو ان کی آخری پناہ گاہ، مسادا (Masada) کو جب رومی فوج نے گھیر لیا تو انہوں نے اجتماعی خودکشی کر کے خود کو گرفتاری

کی ذلت سے بچایا۔

یہودیوں کو ایسی صورتِ حال کا سامنا اس وقت بھی ہوا کہ جب دسویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگ کے موقع پر عیسائی جنگجو مقدس مقامات کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لئے نکلے تو راستے میں ''Rhine'' کی وادی میں مقیم یہودیوں پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر بھی یہودیوں نے اجتماعی خودکشی کر کے خود کو صلیبی جنگجوؤں سے بچایا۔

موجودہ دور میں بھی خودکشی کے یہ واقعات بڑی تعداد میں ملتے ہیں مثلاً ہٹلر کو یہ شبہ تھا کہ مشہور جرنل رومیل (Rommel) اس کے خلاف ہونے والی ایک سازش میں شریک تھا۔ اس پر اسے یہ پیغام دیا گیا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے تو اس صورت میں اسے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنایا جائے گا، بصورت دیگر اس پر غداری کا مقدمہ چلا کر پھانسی دی جائے گی۔ لہٰذا رومیل نے خودکشی کر کے اپنے اعزاز کو محفوظ رکھا۔

لیکن خود ہٹلر کو بھی معہ اپنی بیوی کے اُس وقت خودکشی کرنی پڑی جب روسی فوجیں برلن داخل ہوگئی تھیں اس موقع پر اُس کے وزیر گوبل نے بھی معہ اپنی بیوی بچوں کے خودکشی کر لی۔ اس کے ایک اور وزیر گورِنگ (Goering) نے اُس وقت خودکشی کی کہ جب اُس پر اتحادی فوج کی عدالت میں جنگی جرائم پر مقدمہ چلایا جانے والا تھا۔

موجودہ زمانے میں کئی مشہور شخصیتوں نے خودکشی کی جن میں ہیمنگ وے (Hemming Way) مارلن منرو (Marlin Minro) اور فاسبِنڈر (Fassbinder) شامل ہیں۔

اقتدار اور اختیار

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب کسی فرد کو اقتدار ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ لامحدود اور بے پناہ اختیارات کا مالک بھی ہو جاتا ہے کہ جنہیں نہ تو کوئی چیلنج کر سکتا ہے اور نہ ان کی حکم عدولی، تو اس صورت میں ظلم و ستم اور ناانصافی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے یہ صورت حال اس وقت ہوتی ہے کہ جب اقتدار بادشاہت یا آمریت کی صورت میں کسی ایک فرد کو منتقل ہو جاتا ہے۔

مثلاً جب ایران کے بادشاہ یزدگرد نے چوتھی صدی قبل مسیح میں یونان پر حملہ کیا تو جاتے ہوئے راستے میں دریا پر اس نے پل بنایا، تاکہ اس کی فوج پار کر سکے۔ واپسی پر اُس نے دیکھا کہ دریا میں طوفان آیا تھا، جس کی وجہ سے اس کا بنایا ہوا پل ٹوٹ گیا۔ اس پر اسے سخت غصہ آیا اور اس نے حکم دیا کہ پانی کے اس دریا نے اس کے حکم کی پرواہ نہیں کی اور اس کا بنایا ہوا پل توڑ دیا، لہٰذا اس جرم پر دریا کو کوڑے مارے جائیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ اے گرد آلود پانی کے دریا تیری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تو نے میرے پل کو تباہ کیا۔ اس کے علاوہ جنہوں نے یہ پل بنایا تھا، ان کے سر قلم کر دیئے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقتدار کا نشہ کس قدر بھاری ہوتا ہے کہ جو ذہن کو ماؤف کر دیتا ہے۔

اس کی مثالیں تاریخ میں ان بادشاہوں کے کردار سے ملتی ہیں کہ جو محض اس لئے تخت نشین ہوئے کہ ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور اپنے رشتہ اور پیدائش کی وجہ سے وہ بادشاہ تھے۔ روم کی سلطنت میں اس کی مثالیں اس وقت ملتی ہیں کہ جب اس کی بادشاہت موروثی طور پر شاہی خاندان کے افراد میں منتقل ہوئی، مثلاً روم کے بادشاہ کالی گولہ (Caligulla) کو اپنے گھوڑے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اس کے لئے سنگ مرمر کا اصطبل تعمیر کرایا تھا، اس کے چاروں طرف پہرہ

ہوتا تھا اور یہ ممانعت تھی کہ کوئی وہاں سے نہ گذرے تا کہ گھوڑے کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ یہ ذہنی طور پر اس قدر ماؤف ہو گیا تھا کہ بات بات پر لوگوں کو قتل کرا دیتا تھا، لہٰذا اس کے گارڈز نے تنگ آ کر اسے ہی قتل کر دیا۔

روم کے ایک اور بادشاہ نیرو (Nero) کا یہ حال تھا کہ اس نے ایک ایک کر کے ان تمام شاہی خاندان کے افراد کو قتل کر دیا کہ جن سے اسے ڈر تھا کہ وہ سازش کر کے اسے قتل نہ کر دیں، اس کا یہ معمول تھا کہ رات کو روم کے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر نکل جاتا تھا، اور لوگوں سے سامان چھین لیتا تھا اور اکثر انہیں قتل کر کے ان کی لاش کو گندے نالے میں پھینک دیتا تھا۔ اس کی یہ بھی عادت تھی کہ آئینہ کے سامنے بیٹھ کر اپنے چہرے کو بگاڑتا تھا اور اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود کو موسیقی کا ماہر سمجھتا تھا، اور یونان میں موسیقی کے مقابلوں میں شرکت کر کے خود کو اوّل انعام دلواتا تھا۔ اس کے بارے میں ہے کہ جب ایک مرتبہ شہر روم میں آگ لگی تو اس نے اس سے لطف اُٹھاتے ہوئے گانا گایا۔ اس کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ اپنی حاملہ بیوی کے اس زور سے لات ماری کہ وہ غریب اس صدمہ سے مر گئی، آخر تنگ آ کر اسی کے گارڈز نے اس کو بھی قتل کرنے کا فیصلہ کیا، جس پر اس نے خود کشی کر لی، اور مرتے ہوئے کہا کہ آج دنیا ایک بڑے آرٹسٹ سے محروم ہو رہی ہے۔

روم کے ایک اور بادشاہ ڈائی سیشن کے بارے میں ہے کہ وہ گھنٹوں اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتا تھا اور مکھیوں کو مار کر انہیں پن میں پروتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سینیٹرز کو کھانے کی دعوت دی اور یہ اہتمام کیا کہ وہ کمرہ جس میں کھانے کا انتظام تھا، وہ بالکل کالے رنگ کا ہو، اس کے پردے بھی کالے تھے، ڈائننگ میز بھی کالی، کھانے کے برتن بھی کالے اور کرسیوں پر ہر سینیٹر کا نام لکھا تھا، ساتھ ہی میں قبر کی تصویر تھی، اور اس کے کتبہ پر اس کا نام تھا۔ سینیٹرز یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور سوچنے لگے کہ یہ سب ان کو قتل کرنے کی تیاریاں ہیں۔

روم کے مشہور فلسفی بادشاہ مارکس اوری لیس کے بعد جب اس کا بیٹا کموڈس (Commodus) بادشاہ بنا تو اس کا یہی حال تھا کہ بات بات پر لوگوں کو قتل کرانا، عیاشی میں دن رات گذارنا، اور جنگجوؤں کے مقابلوں میں اس قدر دلچسپی لیتا کہ خود ہی ان سے مقابلہ کرنے کے

لئے میدان میں آ جاتا تھا۔

یہ مثالیں رومی سلطنت کے علاوہ ہمیں عثمانی ترک بادشاہوں اور آخری عہد مغلیہ کے بادشاہوں میں بھی ملتی ہیں کہ جو اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو اذیت دیتے تھے اور انہیں قتل کرا کے خوشی و مسرت محسوس کرتے تھے۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بادشاہ یا آمر کو یہ اختیارات دیئے گئے تھے کہ وہ قانون سے بالاتر ہیں اور ان کے اختیارات پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا اور حکم عدولی کی صورت میں لوگ سزا کے مستحق ہوں گے۔

اختیارات کے غلط استعمال کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کوئی اور دوسرا ادارہ ایسا نہیں تھا کہ جو ان کو روک سکے۔ رومی سلطنت میں اگر چہ سینٹ کا ادارہ تھا، مگر وہ بادشاہ کے اختیارات کو روک نہیں سکے، اس صورت میں ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ سازش کر کے ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے، اس لئے اکثر ایسے شہنشاہ جنہوں نے اختیارات کو غلط استعمال کیا وہ خود اپنے گارڈز کے ہاتھوں مارے گئے۔

دوسرے جب اقتدار موروثی طور پر منتقل ہوتا ہے اور برسرِ اقتدار فرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اور اس کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہے تو وہ اپنے اختیارات کو غلط استعمال کرتا ہے، اور اسے مسرت ہوتی ہے کہ لوگ اس سے خوف زدہ ہیں اور اس کی ہر بات کو تسلیم کرنے پر عمل کرتے ہیں، یہ اس کو نفسیاتی طور پر سکون دیتی ہے۔ کیونکہ موروثی حیثیت میں لیاقت و صلاحیت کو دخل نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ہر ذہین اور لائق آدمی کے خلاف ہوتے ہیں اور انہیں ذلیل کر کے خود کو ان سے ممتاز کرتے ہیں۔ نیرو نے اپنے فلسفی استاد سنیکا (Senica) کو مجبور کیا کہ وہ خودکشی کر لے۔ اس صورت میں یہ خوشامدیوں اور چاپلوسوں کے درمیان گھرے رہ کر خوش ہوتے ہیں۔

یہ صورت حال بادشاہت اور آمریت ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ہمارے جیسے ملکوں میں جمہوریت میں بھی یہ افراد اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے اپنی بالادستی کو قائم کریں، اور خوشامدیوں کے ذریعہ اپنے افضل و برتر ہونے کو تسلیم کرتے ہوئے، دوسرے لوگوں کو

حقیر اور ذلیل سمجھیں۔

لہٰذا اقتدار اس وقت اختیارات کو قانون کے دائرے میں استعمال کرے گا کہ جب اس پر دوسرے ادارے نگاہ رکھیں گے اور اسے قانون کے دائرے میں لاتے رہیں گے۔

مزید یہ کہ اختیارات کے زیادہ استعمال سے فرد کی شخصیت مسخ ہوتی ہے اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔

تاریخ کیا بتاتی ہے

تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میں اکثر سوچتا ہوں کہ افراد اور قومیں آخر کیوں شہرت، دولت، اور آرام و آسائش کی متلاشی رہتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں ایسے افراد ہوتے ہیں کہ جو اپنی صلاحیتوں اور ذہنی لیاقت کو نام و نمود اور دولت کے حصول میں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن جب بھی ایک فرد دولت اور روپیہ پیسہ جمع کرے گا تو وہ یہ دوسروں کی قیمت پر کرے گا۔ کوئی فرد اس وقت تک اپنی جائیداد کو وسعت نہیں دے سکتا، جب تک کہ وہ دوسروں کی محنت کا استحصال نہ کریں۔ جو افراد ہر قیمت پر کامیابی کے خواہاں ہوتے ہیں، اور غربت سے امارت تک جاتے ہیں، ایسے افراد معاشرہ میں ماڈل بن جاتے ہیں، اور دوسروں کو اسی راہ پر چلنے کی ترغیب ملتی ہے۔ اکثر یہ افراد مال و دولت اور جائیداد کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں، اور وقت کے ساتھ ان کے یہ وارث اس دولت کو استعمال کر کے عام لوگوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتا ہے۔

یہی سلسلہ ہم شاہی خاندانوں کے زوال میں دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں مغل خاندان اپنے عروج پر پہنچا، مگر جب یہ 1857ء میں ختم ہوا تو اس کے افراد جن میں شہزادے اور شہزادیاں شامل تھیں، لال قلعہ سے نکل کر در بدر ہوئیں، اور آج کبھی کسی اخبار میں یہ خبر آتی ہے کہ مغل خاندان کے کچھ افراد غربت اور مفلسی کے عالم میں کسی کونے میں زندگی گذار رہے ہیں۔ لوگوں کو وقتی طور پر صدمہ ہوتا ہے اور پھر سب کچھ بھول کر اپنی زندگی کے معمولات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب عثمانی ترک بادشاہوں کا خاتمہ ہوا، تو ان کے حرم سے عورتیں، کنیزیں اور دوسرے لوگ جب باہر کی دنیا میں آئے تو ان کے لئے ہر چیز نئی تھی، وہ اس نئی زندگی کے عادی نہیں تھے، وہ حرم کی چار دیواری میں مقید خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ باہر کی دنیا نے ان کی زندگی کو بے انتہا مسائل سے

دوچار کردیا۔

اس کی ایک اور مثال فاتحین کی ہے، جو اپنی قوت وطاقت اور ذرائع کی بنیاد پر دوسروں کے ملکوں پر قبضہ کرنے اور ان کی دولت لوٹنے چلے تھے۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ جن ملکوں پر قبضہ کیا جائے اور جن قوموں کو شکست دی جانے ان کا قتل عام کیا جائے تا کہ ان کی مزاحمت کرنے والا کوئی نہ ہو۔ سکندر جہاں جہاں گیا وہ قتل وغارت گری کا بازار گرم کرتا ہوا گیا۔ جب چنگیز خاں نے منگولوں کو متحد کیا تو اس کے لشکر نے خوارزم میں تباہی مچائی، شہروں کو مسمار کر دیا گیا، لوگوں کا قتل عام کیا گیا، عورتوں کو بطور کنیز استعمال کیا گیا۔ کاریگروں کو گرفتار کر کے منگولیا لے جایا گیا تا کہ وہ وہاں تعمیراتی کام کریں۔

چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے اسلامی دنیا کو بنجر اور ویران کر دیا۔ اس نے اسماعیلیوں کے قلعہ الموت پر حملہ کر کے اس کے نادر کتب خانے کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کتب خانے میں قیمتی مسودات تھے، کیونکہ اسماعیلی امام اسلامی دنیا کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتے تھے، وہ سب منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ سب سے زیادہ تباہی اس وقت آئی جب ہلاکو خاں نے بغداد پر قبضہ کیا۔ یہ اس وقت عباسی خلفاء کا دارالخلافہ تھا، علم وادب کا مرکز تھا۔ یہاں مسلمان، یہودی اور عیسائی مذہبی رواداری کے ساتھ رہ رہے تھے۔ قبضہ کے بعد منگولوں نے اول تمام کتب خانوں کی کتابوں کو دریا میں پھینک دیا۔ کہتے ہیں کہ مسودات کی روشنائی سے دریا کا پانی کالا ہو گیا۔ اس کے بعد شہر کے رہنے والوں کو اکٹھا کر کے دریا کے کنارے ان کا قتل عام کیا، اس سے دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ یہاں بھی خوبصورت عورتوں کو بطور کنیز فوج میں تقسیم کیا، اور قتل کے بعد لوگوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر اپنی فتح کا جشن منایا۔ آخری عباسی خلیفہ کو قالین میں لپیٹ کر مارا تا کہ اس کا خون نہ بہے۔

چنگیز کے دوسرے پوتے باطو نے روس، ہنگری اور پولینڈ میں لوگوں کا قتل عام کیا۔ منگولوں کی اس تباہی نے اسلامی دنیا اور اس میں ہونے والی ترقی کو روک دیا۔ شہر اُجڑ گئے، کاروبار ختم ہو گیا، لوگ جان بچا کر دوسرے ملکوں کو ہجرت کر گئے، ہندوستان میں علماء اور کاریگروں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے آئی اور اسے اپنا نیا وطن بنایا۔

یہ تباہی و بربادی منگولوں کے علاوہ دوسرے فاتحین بھی کرتے رہے۔ مگر اس کا انجام کیا

ہوا؟ سکندر کے مرنے کے بعد اس کی وسیع سلطنت اس کے جرنیلوں میں تقسیم ہو کر بالآخر ختم ہو گئی۔ منگولوں نے جو وسیع علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وقت کے ساتھ ان کے خاندان کمزور ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔ یہی حال دوسری قوموں کا ہوا، چاہے وہ روسی سلطنت ہو، یا عربی فتوحات ہوں، یا موجودہ زمانے کی سامراجی طاقتیں ہوں، یہ سب وقت کے ساتھ زوال پذیر ہو کر تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں، اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ افراد بھی اپنے طور پر دولت و اقتدار کے حصول میں مصروف رہتے ہیں اور یہ سماجی قوتیں دنیا کے امن و امان اور خوش حالی کو ختم کر کے اپنے اقتدار کو وسعت دیتی ہیں مگر آخر میں یہ سب کچھ ناپائیدار رہتا ہے۔

اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اب ممکن ہے کہ افراد اپنی جگہ مطمئن رہیں اور دوسروں کا استحصال کر کے اپنی دولت اور جائیداد بنانے کی کوشش نہ کریں، اور کیا ممکن ہے کہ قومیں فتوحات کی بنیاد پر عظیم بننے کے خواب دیکھنا بند کریں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ افراد اور قومیں اپنی صلاحیتوں اور روایتی لیاقتوں کو علم و ادب، موسیقی اور آرٹ کی تحقیق میں صرف کریں تاکہ یہ دنیا امن و امان سے دوچار ہو، اور ہر فرد سکون و اطمینان کی زندگی گذار سکے؟

دانشور اور سیاستداں

وہ دانشور جو ترقی پسند ذہن رکھتے ہیں، اور سماج کو تبدیل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ سماج کے ذہن کو بدلنے اور تبدیلی کے راستے کو ہموار کرنے کے لئے ایسے نظریات و افکار اور خیالات کو مقبول بنایا جائے کہ جن کی مدد سے سماج کی فرسودہ روایات اور اداروں کا خاتمہ ہو، اور معاشرہ اس پر تیار ہو کہ وہ جدید روایات کو اختیار کرے۔

دانشور جب سماج کے مسائل اور اس کی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک سرجن مریض کا آپریشن کرتا ہے اور غیر جانبداری کے ساتھ اس کے مرض کی تہہ تک پہنچ کر اس کا علاج کرتا ہے، اسی طرح سے دانشوروں کے خیالات اور ان کی تحریریں ایسے اوزار اور ہتھیار ہوتی ہیں کہ جن کی مدد سے مسائل کی بنیاد تک پہنچا جا سکتا ہے، اسی صورت میں ان کا حل بھی ممکن ہوتا ہے۔

دانشور جب سماج، اس کی روایات، رویوں اور اداروں پر تنقید کرتا ہے تو اس کا مقصد سماج کی فرسودگی کو دور کرنا ہوتا ہے، وہ قطعی نہیں چاہتا ہے کہ اپنی تحریروں سے عوام میں مقبولیت حاصل کرے، یا ایسے نظریات تخلیق کرے کہ جن سے لوگ خوش ہوں، چونکہ وہ کسی اقتدار کا خواہش مند نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ ایسی تنقید کرتا ہے کہ جو لوگوں کو ناگوار گذرتی ہے۔ خاص طور سے ان طبقات کو کہ جو پرانے نظام میں مراعات یافتہ ہوتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے دانشور اپنے زمانے اور عہد میں معتوب رہتے ہیں، مگر ایک وقت کے بعد جب تبدیلی آتی ہے تو ان کے افکار کو زندہ کر کے ان سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور ان کی اہمیت کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ان دانشوروں کو اپنی زندگی میں تو کوئی صلہ نہیں ملتا ہے، مگر ان کے مرنے کے بعد ان کے نظریات ایک نئی توانائی کے ساتھ اُبھر کر آتے ہیں۔

دانشوروں کے مقابلہ میں سیاستدان ایک دوسرے ہی مختلف کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کا مقصد معاشرہ میں تبدیلی لانا نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ اقتدار میں آنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی تقریروں کے ذریعہ لوگوں کو خوش رکھنا چاہتے ہیں، اور اس پر نظر رکھتے ہیں کہ لوگ کیا چاہتے ہیں، وہ اپنے خیالات اور نظریات کو بھی بدل لیتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ اپنی نجی زندگی میں سیاستداں بڑے سیکولر اور روشن خیال ہیں مگر عوام کے سامنے جا کر اپنی تقریروں سے وہ انتہائی مذہبی یا قدیم خیالات کے حامی بن جاتے ہیں۔

یورپ میں روشن خیالی کے زمانے میں دانشوروں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اپنے خیالات اور افکار کا اظہار کریں، کیونکہ اس وقت جمہوریت کی ابتداء تھی اور سیاستدان بھی مکمل طاقت حاصل نہیں کر سکتے تھے مگر جب یورپ میں جمہوریت کی قدریں مضبوط ہوئیں تو سیاستدانوں کو یہ مواقع مل گئے کہ وہ اقتدار میں آنے کے لئے عوام کی خواہشات کے مطابق اپنے خیالات کی تشکیل کریں۔

اس ماحول میں جب دانشوروں اور سیاستدانوں کا ٹکراؤ ہوا تو اس میں دانشور لوگوں کو متاثر کرنے میں تقریباً ناکام ہو گئے اور ان کے مقابلے میں سیاستدانوں نے اپنی برتری قائم کر لی۔ مثلاً جرمنی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد، ترقی پسند دانشوروں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ جنگ کے بعد کی تباہ کاریوں سے قوم کو نکال کر ایک ایسا نظام قائم کریں کہ جس میں عوام کو بنیادی ضرورتیں مل سکیں۔ مگر سیاستدانوں نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ روزالکسمبرگ (Rosa Laxmberg) اور لیب کنیخت (Lieb Knecht) کو قتل کرا دیا گیا۔ جب جرمنی میں نازی پارٹی کا عروج ہوا، تو اس کے مقابلہ میں ترقی پسند دانشوروں کی آواز کو نظرانداز کر دیا گیا۔ جب ہٹلر اقتدار میں آیا تو جرمنی کے بیشتر دانشور ملک چھوڑ کر چلے گئے، جس کی وجہ سے جرمنی کی دانشورانہ زندگی بنجر ہو کر رہ گئی۔

ہٹلر کی جذباتی تقریروں نے جرمنی کے عوام کو اس قدر متاثر کیا کہ لوگ اس کے حامی ہو گئے، اور اس کے مقابلہ میں دانشوروں کی باتوں کو ایک طرف رکھ دیا۔

اسی قسم کی صورت حال سے ہندوستان دوچار ہوا۔ یہاں دانشوروں کا ایک مضبوط طبقہ

آزادی کے بعد وجود میں آیا، ان میں مورّخ، اور دوسرے سماجی علوم کے ماہرین ہیں۔ ان لوگوں نے آزادی سے قبل اور بعد میں فرقہ وارانہ جذبات اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات پر بہت کچھ تحریر کیا۔ ان میں بپن چندر، رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا، گیان پانڈے اور اے۔آر شرما قابلِ ذکر ہیں۔

جب بھی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو دانشور، صحافی اور سیاسی کارکن فوراً موقع پر پہنچے اور فسادات کا تجزیہ کر کے اس کے اصل محرکات کو اُجاگر کیا۔ ان میں خاص طور سے اصغر علی انجینئر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے فسادات کے بارے میں لکھ کر ان کے اثرات کا جائزہ لیا۔

جب بابری مسجد کا واقعہ پیش آیا تو ہندوستان کے مشہور مورخوں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا کہ مسجد کے مقام پر رام جنم بھومی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر ان کے مقابلے میں جب بی۔ جے۔ پی نے مظاہرے کئے، اور ایڈوانی نے رتھ یاترا نکالی تو عوام ان مظاہروں اور ہندومت کی ان علامتوں سے متاثر ہوئے اور بی۔ جے۔ پی ایک مقبول پارٹی بن گئی۔

اسی طرح جب گجرات میں فسادات ہوئے، جس کی پوری ذمہ داری مودی کی تھی کہ جو اس وقت وہاں کا وزیراعلیٰ تھا۔ اس موقع پر بھی دانشوروں اور صحافیوں نے ان فسادات پر لکھا، اور مودی کو ان کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ مگر اس کے باوجود بی۔ جے۔ پی کے سیاستدانوں کے نعرے دانشوروں کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب رہے اور بالآخر مودی کو وزیراعظم کے عہدے تک پہنچا دیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے معاشرہ تعلیم یافتہ ہو یا اَن پڑھ، ان دونوں صورتوں میں سیاستداں جذبات کے ذریعہ ان کے ذہن پر قابو پا لیتے ہیں، جب کہ دانشور عقل اور استدلال کے ذریعہ بات کہہ کر لوگوں پر کم اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ جب قومیں جذبات کی لہروں میں آ کر تباہ ہوتی ہیں جیسے ہٹلر کا جرمنی ہوا، تو اس وقت، تو کوئی سبق نہیں سیکھتے ہیں مگر بعد میں تباہی ان کو تبدیل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

جرمنی میں ہٹلر کی تباہی نے جرمن قوم کو سبق دیا اور انہوں نے اس سے سیکھا اور اپنے سماج کو نئے سرے سے تشکیل دیا۔

کیا ہندوستان بھی مودی کے اقتدار میں آنے کے بعد، مستقبل میں جن مشکلات سے دوچار ہوگا، اور فرقہ وارانہ فسادات میں اُلجھے گا، اس کے بعد کچھ سیکھے گا؟ کیونکہ اس وقت تو ہندوستان کے دانشور سیاستدانوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے ہیں۔

انسانی فطرت اور سماج

انگریز فلسفی تھامس ہابس (Hobbes) نے انسانی فطرت اور اس کی تشکیل پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ جس ماحول میں انسان کے ذہن کی تعمیر ہوئی اور اس کے رویئے بنے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب انسان فطرت کی سختیوں اور ماحول کی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے چاروں اطراف خطرات تھے، اس نے اس کے ذہن میں ڈر اور خوف کو پیدا کیا، اور اس احساس کو پیدا کیا کہ وہ کسی وقت بھی حادثہ کا شکار ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس کا ذہن اس ماحول میں اس بنیاد پر تشکیل ہوا کہ اسے اپنی بقاء کے لئے اس سے پہلے کہ وہ خطرے یا سازش کا شکار ہو، اپنے مخالفین کو ختم کردے، اب جب کہ سماج میں ہر فرد یا جماعت کو یہ احساس ہو کہ دوسرا اسے ختم کرنے کے لئے تیار ہے اور اسے پہل کرنی چاہئے تو اس نے جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کو پیدا کیا۔

ہابس کے اس نظریہ کا اطلاق آج کے حالاتِ حاضرہ پر بھی ہوتا ہے کہ جب بڑی طاقتیں اس خیال سے کہ ان کے مخالف ان پر حملہ کر کے انہیں نقصان پہنچائیں، انہیں ختم کر دیا جائے، اسے وہ (Pre-emptive) حربہ کا نام دیتے ہیں۔

انسان اور سماج کے رویے کو روکنے کے لئے ایک طرف تو ریاست کا ادارہ وجود میں آیا کہ جس کے اداروں نے یہ کوشش کی کہ فرد کو تحفظ کی یقین دہانی ہو، اور اس میں جو ڈر اور خوف کا احساس ہے وہ دور ہو۔ اس کے علاوہ سماج میں ہم آہنگی اور یگانگت کو پیدا کرنے کی غرض سے رسم و رواج اور اخلاقیات کا وجود عمل میں آیا تا کہ فرد میں جو وحشت اور درندگی ہے اس کو کنٹرول کیا جائے اور سماج میں توازن کو قائم رکھا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوانین، اور اخلاقی قدروں کے ذریعہ انسان کی وحشی حیثیت کو روکا گیا اور اس کی تربیت کی گئی کہ وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے، ڈر اور خوف سے نجات پائے۔ چنانچہ ہم

دیکھتے ہیں کہ ان ملکوں میں کہ جہاں ریاست اوراس کے ادارے مضبوط ہیں اور جہاں قانون کی بالادستی ہے، اور جہاں تہذیبی قدریں موثر ہیں وہاں انسان کے وحشی جذبات کو دبا دیا گیا ہے۔ لیکن جن ملکوں میں ریاست کی اتھارٹی ٹوٹ گئی ہے، اس کے ادارے ناکام ہو گئے ہیں اور جہاں قانون کی بالادستی خود کو برقرار نہیں رکھ سکی ہے، اور جہاں اخلاقی اقدار کا کوئی اثر نہیں رہا ہے وہاں انسان میں وحشی درندگی ابھر کر آ گئی ہے، کیونکہ اس کو روکنے والی قوتیں ناکام ہو گئیں ہیں۔ اس صورت میں انسان کو اپنی زندگی اور اس کی بقاء کی فکر ہے، اور اسے یہ ڈر ہے کہ دوسرا جو اس کے اردگرد اور قرب میں ہے وہ اسے ختم کر دے گا، اسے قتل کر دے گا اور اس مال و جائیداد پر قابض ہو جائے گا۔ یہ ڈر اور خوف سماج میں تصادم اور خوں ریزی کو پیدا کرتا ہے اور انسان ایک بار پھر اسی ماحول اور زمانے میں پہنچ جاتا ہے کہ جہاں سے اس نے سفر کی ابتداء کی تھی۔

اس وقت پاکستانی معاشرہ اس صورت حال سے دوچار ہے۔ جب سے کہ ریاست کمزور ہوئی ہے اور قانون کی بالادستی دم توڑ چکی ہے اس وقت سے اخلاقی اور تہذیبی قدریں بھی اپنے اثر ورسوخ کو قائم نہیں رکھ سکی ہیں۔ اس ماحول میں جب کہ فرد پر کوئی پابندی نہیں ہے اور وہ اپنے عمل میں بالکل آزاد ہے، تو اس صورت میں طاقت ور کو یہ مواقع ہیں کہ اپنی قوت کو استعمال کرتے ہوئے کمزور کو زیردست کرے، اور اس پر اپنی حکمرانی قائم کرے۔ اس نے سماج میں مافیا اور جرائم پیشہ افراد کو طاقت ور بننے اور آزادانہ کارروائیاں کرنے کے مواقع فراہم کئے۔ دوسری جانب ایسی سماجی اور مذہبی جماعتیں وجود میں آئیں کہ جن کی خواہش ہے کہ وہ اپنے مخالفین کا خاتمہ کر کے اپنی اجارہ داری کو قائم کریں۔ اس عمل میں وہ مخالفین کو کمزور کرنے کے لئے قتل، خوں ریزی اور تباہ و بربادی کے عمل پر یقین رکھتی ہیں۔

لہٰذا اس رویہ کی بناء پر ہر جماعت اور گروپ میں ڈر اور خوف ہے، اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ ہر تنظیم ہتھیار بند ہو گئی ہے تا کہ اپنا تحفظ کر سکے۔ اب صرف تحفظ ہی نہیں بلکہ اس ڈر اور خوف سے کہ دوسرا اس پر حملہ کر کے اسے ختم نہ کر دے، وہ اس پر عمل کرتے ہیں کہ وہ پہل کر کے اپنے مخالف کا خاتمہ کر دیں۔ اس وقت پاکستان کے سماج میں جو قتل و غارت گری کا اظہار روزمرہ کے ہونے والے واقعات سے ہوتا ہے۔

پاکستان کے سماج میں یہ ڈر اور خوف اور موت کے غیر متوقع ہونے کا احساس ہر فرد کے

ذہن میں سمایا ہوا ہے۔ موت اس کے لئے ایک فطری نتیجہ نہیں، بلکہ یہ حادثاتی عمل ہے، جو کسی وقت بھی غیر متوقع طور پر ہو سکتی ہے۔

پاکستانی سماج کی یہ صورت حال اس وقت تک بہتر نہیں ہوگی جب تک کہ ریاست اور اس کے ادارے مضبوط ہو کر اس میں تحفظ کے احساس کو پیدا نہیں کریں گے اور جب تک قانون اور اخلاقی اقدار موثر کردار ادا نہیں کریں گی، اس وقت تک انسان خود کو فطرت کے اس ابتدائی دور یا زمانہ میں پائے گا کہ جس کے بارے میں ہابس نے کہا تھا کہ اس میں انسان کی زندگی مختصر، درندگی اور نفرت و عداوت کا شکار ہوتی ہے۔ اس زندگی میں نہ تو وہ تہذیب کی تشکیل کر سکتا ہے نہ کلچر کو پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کا تمام وقت ڈر اور خوف کے عالم میں گذرتا ہے، جو اس کی صلاحیتوں کو کچل دیتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ اس وقت اسی صورت حال سے دوچار ہے۔

آثارقدیمہ اورعوام

جدید تاریخ نویسی میں اب حکمرانوں اور اشرافیہ کے کارناموں کے بجائے مورخ عام لوگوں کی تاریخی اہمیت پر لکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو اب تک تاریخ سے محروم تھے اب اُن کا ذکر تاریخ کے صفحات پر نظر آنے لگا ہے اور تاریخ کی تشکیل میں اُن کے حصے کو تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

یہ تبدیلی علم آثارِقدیمہ میں بھی آئی ہے۔ اس سے پہلے ماہرین آثارقدیمہ کی دلچسپی اس میں تھی کہ حکمرانوں کے محلات، مقبروں اور مندروں کو دریافت کیا جائے کیونکہ اس دریافت میں قدیم حکمرانوں کی شان و شوکت اور اُن کی دولت کے آثار ملتے تھے اس لئے ان کی توجہ ان دریافتوں تک محدود رہی۔ لیکن اب ماہرین تاریخ کے قدیم آثاروں میں عام لوگوں کی موجودگی اور اُن کی روزمرہ کی زندگی کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہ ایک حیران کن کام ہے کیونکہ عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں مِٹے ہوئے آثاروں سے اُن کی زندگی کے بارے میں تشکیل کرنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ عام لوگوں کے مٹی کے گھر وقت کے ہاتھوں شکستہ ہو کر تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ ماہرین نے اُن اوزار آلات اور مٹی کے برتنوں کے ذریعے جو انہیں کھدائی کے دوران ملے ہیں اُن سے عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔

معلومات کا ایک اہم ذریعہ وہ کوڑا کرکٹ اور کچرا ہے جسے لوگوں نے استعمال کے بعد اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کوڑا کرکٹ اور کچرے کی مدد سے وہ تمام لوگوں کی روزمرہ کی زندگی اور اُن کی استعمال شدہ چیزوں کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہیں۔ مردہ لوگوں کی ہڈیوں کی کیمیکل تحقیق سے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ کونسی غذا استعمال کرتے تھے اور کن بیماریوں میں مبتلا تھے۔ یونان کے شہری اپنا ووٹ ٹھیکریوں پر امیدوار کا نام لکھ کر دیا کرتے تھے۔ یہ ٹھیکریاں جنہیں بے کار سمجھ کر پھینک دیا جاتا۔ اب ماہرین ان کی مدد سے ایتھنز کے جمہوری عمل پر تحقیق کر رہے ہیں۔

مثلاً کافی ٹھیکریوں پر ایک ہی رسم الخط میں نام لکھے ہوئے ہیں۔اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ چونکہ عام لوگ اَن پڑھ تھے اس لئے انہوں نے ایک ہی شخص سے اپنی پسند کے امیدوار کا نام لکھوایا۔اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی شخص نے یہ نام لکھ کر جالی ووٹ ڈالے ہوں۔اس طرح کوڑے کچرے کے اُن آثاروں سے ماہرین عام لوگوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کا تجزیہ کررہے ہوں۔

مصر کی تہذیب کا مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ احراموں کی تعمیر میں غلاموں نے نہیں بلکہ مصر کے عام لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ان کی یہ ساری محنت بیگار تھی جس کا انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔حال ہی میں قاہرہ کے قریب ایک قدیم گاؤں دریافت ہوا ہے جو المدینے کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔کیونکہ اس گاؤں کے مکانات محفوظ ہیں اس لئے ماہرین نے کسانوں کی روزمرہ کی زندگی اور اُن کے معمولات کے بارے میں بہت کچھ تاریخی مواد اکٹھا کیا ہے۔مثلاً یہ کسان دریائے نیل کے کنارے کی کھیتی باڑی کرتے تھے۔جس کا ایک حصہ انہیں لگان کی صورت میں ریاست اور مندر میں دینا ہوتا تھا۔کھیتی باڑی کے علاوہ یہ کسان پائیرس (Payrus) سے مختلف اشیاء بناتے تھے۔اس کا ایک سب سے بڑا استعمال لکھائی کے مواد کے طور پر استعمال ہوتا تھا جو مصر سے دوسرے ملکوں کو درآمد کیا جاتا تھا۔اس کے بھی شواہد ملے ہیں کہ کسان عورتیں نہ صرف کھیتی باڑی میں مدد کرتی تھیں بلکہ مویشیوں کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی اُن کی تھی۔کچھ عورتیں اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لئے میک اپ کا سامان بھی تیار کرتی تھیں۔گاؤں میں اوزار اور آلات کو بنانے کے ساتھ ساتھ اُن کی مرمت کے لئے کاریگر ہوا کرتے تھے۔ان کے گھروں میں لکڑی کا استعمال تقریباً ناپید تھا کیونکہ درختوں اور جنگلات کے نہ ہونے سے لکڑی بہت مہنگی تھی اور دوسرے ملکوں سے برآمد کی جاتی تھی۔اس لئے صرف امراء ہی اس کا استعمال کرتے تھے۔اس گاؤں کی مدد سے عام لوگوں کی زندگی کا اندازہ ہوا کہ وہ محنت اور مشقت سادگی اور روزمرہ کے مسائل سے بھرپور تھی۔

ماہرین آثار قدمہ نے مختلف تہذیبوں، غلاموں کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کی ہیں ان غلاموں سے معدنیات کی کانوں میں کام کرایا جاتا تھا۔مناسب سہولتوں کے نہ ہونے سے یہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے کانوں میں جاتے تھے اور کھدائی کا کام کرتے تھے جس کی

وجہ سے مٹی اور گیس سانس کے ذریعے ان کے جسم میں داخل ہو کر انہیں بیمار بھی کرتی تھیں اور ان کی موت کا بھی سبب ہوتی تھی۔

آثار قدیمہ میں جب عوام کی کاوشوں اور اُن کے کام کو جب تاریخ کا حصہ بنایا تو اس کی وجہ سے اُن کی اہمیت کا احساس ہوا اور یہ بھی احساس ہوا کہ تاریخ بنانے کا کام صرف حکمراں یا امراء ہی نہیں کرتے بلکہ اس میں زیادہ حصہ اُن گمنام لوگوں کا ہوتا ہے جنہیں تاریخ نے فراموش کر دیا ہے۔ لیکن اب اُن فراموش اور گمنام لوگوں کے کام کو تسلیم کر کے تاریخ کو نئے معنی دیئے گئے ہیں کہ جب ماضی میں عوام کے کام کو تسلیم کر لیا گیا تو اب موجودہ زمانے میں بھی ان کی محنت اور مشقت اور جدوجہد کو آج بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ بمقابلے اُن طبقات کے جو اپنے خاندان دولت اور مراعات کے سہارے عوام کا استحصال تو کرتے ہیں لیکن اُن کے کام کی اہمیت کو ماننے پر تیار نہیں۔ تاریخ ہمیں بہت کچھ سکھانے پر تیار ہے۔ مگر کیا ہم اُس سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

فلسفہ اور عقیدہ

یونان اور روم کے لوگ کئی دیوی اور دیوتاؤں کے ماننے والے تھے۔ انہوں نے اُن کی عقیدت میں شاندار مندر تعمیر کرائے۔ انہیں خوش رکھنے کے لئے قربانیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور اُن سے محبت کا اظہار کھیلوں اور ڈراموں کے مقابلے منعقد کرا کے کیا۔ لیکن اس محبت اور عقیدت کے باوجود اُن کے دیوی دیوتاؤں کا تعلق اُن کے سماجی اور سیاسی مسائل سے نہیں تھا وہ اُن کی نجی زندگی میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ معاشرے کے اصول وضوابط اور اخلاقیات کے لئے قانون دان اور فلسفی اپنے نظریات اور افکار سے تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں معاشرے کی اصلاح کرتے تھے۔ مثلاً یونان میں ابتداء میں ڈریکو (DRACO) نامی ایک شخص نے جرائم کی روک تھام کے لئے سخت قوانین بنائے۔ لیکن جب یہ قوانین ناکام ہوئے تو چھٹی صدی قبل مسیح میں سولن (Solan) نامی ایک شخص نے ایک نیا قانون ترتیب دیا جس کے تحت کوشش کی گئی امیر اور غریب کے درمیان فرق کو کم کیا جائے۔ ایتھنز کے باشندوں کو غلام نہیں بنایا جائے۔ غیر ملکی تاجروں کو خوش آمدید کہا جائے اور زیتون کے درختوں کی زیادہ سے زیادہ کاشت کی جائے تاکہ اُس کا تیل برآمد کیا جاسکے۔

اسی طرح سے اسپارٹا (Sparta) میں لیکرگس (Lacurgus) نے قوانین کا ایک مجموعہ دیا۔ ان تمام قوانین کا تعلق دیوی دیوتاؤں سے نہیں بلکہ انسانوں سے تھا جنہوں نے معاشرے کی ضرورت کے مطابق اُن کا نفاذ کیا۔

کسی بھی معاشرے کے لئے قانون کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ چھٹی صدی قبل مسیح عیسوی میں یونان کے ایک فلسفی ہرک لائٹس (Heraclitus) نے اس بات کا اظہار کیا کہ روایات اور ادارے ہمیشہ ضرورت کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی قدر یا ادارہ

ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ معاشرہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ انسان ایک ہی دریا میں دوبارہ پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ اس فلسفے کے تحت معاشرے میں کثیرالجہتی (Pluralism) کا ہونا لازمی ہے کیونکہ یہ معاشرے کے مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگوں کو اکٹھا کرتی ہے۔

یونان کے بعد رومیوں نے بھی یونانی فلسفے اور قانون کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے معاشرے میں اُن کو رواج دیا۔ رومی قوانین بھی اُن کی ایمپائر (Empire) کے تحت وجود میں آئے۔ رومی فلسفیوں نے معاشرے میں اخلاقی قدروں کی اہمیت پر زور دیا۔ خاص طور سے (Stoicism) کا فلسفہ جو قانون اور معاشرے کی روایتی تنظیم پر زور دیتا ہے اس فلسفے (Seneca) (Cicero) اور (Marcus Aurelius) رومی ایمپائر میں فروغ دیا۔ لیکریشس (Lucretius) نامی فلسفی نے دیوی دیوتاؤں سے انکار کرتے ہوئے سماج میں اخلاقی قدروں پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا۔

یونانی اور رومی سماج میں اُس وقت تبدیلی آئی جب 313 عیسوی میں رومی شہنشاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا جس کے بعد کوشش کی گئی کہ غیر عیسائی فلسفے، قوانین اور افکار سے معاشرے کو پاک کیا جائے۔ چنانچہ عیسائی چرچ نے پیگن (Pagan) فلسفیوں کے خلاف تحریک شروع کی اور کوشش کی کہ فلسفے کی جگہ اُن کے عقیدے کا غلبہ ہو۔ اُن کے دیوی دیوتاؤں کے مندروں کو بند کیا گیا اُن کی تعلیمات کو ممنوع قرار دیا گیا اُن سختیوں کی وجہ سے یہ فلسفی دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ بعد میں آنے والے بازنطینی شہنشاہ مذہب کے معاملے میں اس قدر متعصب تھے کہ اُن میں سے ایک نے ایتھنز میں افلاطون کی قائم شدہ اکیڈمی جو فلسفے کی تعلیمات کا مرکز تھی اُسے بند کرا دیا۔ مذہب کے پُرجوش ماننے والوں نے اسکندریا کی مشہور (Library) لائبریری جس میں لاکھوں قیمتی مسودات موجود تھے کہ اُن کا تعلق غیر عیسائی افکار سے تھا۔ جسٹینین (Justinian) نامی ایک شہنشاہ نے جو مذہبی معاملات میں انتہا پسند تھا اور جس نے بازنطینی سلطنت میں قوانین بنائے اُس نے تمام غیر عیسائی فرقوں کو ختم کر کے عیسائیت کے عقیدے کو نافذ کیا۔

جب مذہبی عقیدے کو فلسفے پر غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کے نتیجے میں یونان اور روم میں نہ تو کوئی فلسفی پیدا ہوا اور نہ ہی کوئی نئے افکار کی تخلیق ہوئی اس لئے جب رومی ایمپائر ختم

ہوئی تو یورپ علم کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ کیونکہ فلسفے کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ عقیدے کو درست اور صحیح ثابت کیا جائے یوں فلسفہ مذہب کی گرفت کا شکار ہو گیا اور اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کا خاتمہ ہو گیا۔

عہد وسطیٰ میں ارسطو کے فلسفے کو عیسائیت کی تعلیمات میں ڈھال کر اسے عقیدے کی شکل دیدی۔ ہزار برس تک ارسطو کا اثر عیسائی دنیا پر رہا، اور کوئی نیا فلسفہ پیدا نہیں ہو سکا۔ یونان اور روم کے فلسفیوں کی تحریریں غائب ہو گئیں۔ لوگ سقراط اور افلاطون کو بھول گئے۔ یورپ میں اس وقت تبدیلی آئی جب پندرھویں صدی میں یہاں ریناساں یا نشاطِ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تو اس وقت یورپ کے اسکالرز نے دوبارہ سے یونان اور روم کے فلسفیوں کو دریافت کیا۔ جس نے چرچ کے عقائد کو چیلنج کرتے ہوئے نئے خیالات اور افکار کی ابتدا کی۔ جس کی وجہ سے یورپ کے معاشرے میں فلسفہ عقیدے پر غالب آ گیا۔

عورت کا المیہ

افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریت'' (Republic) میں جہاں گارجین آف ڈیموکریسی یا جمہوریہ کے محافظوں کا ذکر کیا ہے وہ عورت اور مرد کو برابر کا مقام دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک عورتوں میں بھی وہی ذہانت اور صلاحیت ہوتی ہے جو مردوں میں ہوتی ہے اس لئے عورتیں بھی برابر سے حکمرانی کا حق رکھتی ہیں۔ چار صدی قبل مسیح میں عورتوں کے بارے میں ان خیالات کا اظہار بڑا انقلابی تھا جبکہ یونان کے معاشرے میں عورتیں گھر کی چار دیواری میں قید تھیں انہیں گھر سے نکلنے اور بازار سے سودا سلف لانے کی بھی اجازت نہیں تھی، اور نہ ہی اُن کے لئے تعلیم کے مواقع تھے۔ اس ماحول میں عورتوں کے بارے میں افلاطون کے خیالات چونکا دینے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے شاگرد ارسطو نے ان خیالات پر سخت تنقید کی۔ اُس کا استدلال تھا کہ چونکہ عورتیں حمل کے دوران ناپختگی کی حالت میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے مردوں کے مقابلے میں وہ کم تر ہیں۔ اس کم تری کی ایک اور مثال دیتے ہوئے اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ مروں کے بتیس دانت ہوتے ہیں اور عورتوں کے اٹھائیس۔

یونان کے ان دو فلسفیوں کے متضاد نظریوں میں سے ارسطو کے خیالات کو مقبولیت ملی اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کی تہذیبوں میں مرد کی بالادستی قائم ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ عورتوں کو برابر کا مقام دینے کو تیار نہیں تھے یہاں تک کہ عورت کی حیثیت گھٹ کر مرد کی ملکیت ہوگئی۔ جس کی اپنی کوئی ذاتی شناخت نہ رہی اس کم تری کی وجہ سے اُس نے تاریخ میں ظلم و ستم اور جبر کو برداشت کیا مثلاً جنگوں میں شکست کے بعد فاتحین مردوں کو قتل کر دیتے تھے اور عورتوں کو بطور کنیز گرفتار کر کے مالِ غنیمت کی طرح فوجیوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یونانی ڈرامہ نگار یورپیڈس (Uripidus) نے اپنے ڈرامے ٹروجن کی عورتیں (Women of Trojan) میں ٹرائے (Troy) کی جنگ

کا ذکر کیا ہے کہ جس میں یونانیوں نے فتح کے بعد شہر کے مردوں کا قتل عام کیا اور پھر اُن کی عورتوں کو جن میں شاہی خاندان کی بیگمات اور شہزادیاں بھی شامل تھیں نے بطور انعام فوجیوں میں تقسیم کیں۔ یہ روایت تقریباً ہر معاشرے میں جاری رہی کہ جنگ کی صورت میں عورتوں کو اُٹھا کر لے جانا اِس کو بھی فتح کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً چنگیز خان کے ابتدائی زمانے میں ایک قبائلی جنگ میں اُس کی شکست کے بعد اُس کی بیوی کو مخالف سردار اُٹھا کر لے گیا لیکن ایک سال بعد چنگیز خان نے اُس کو شکست دے کر اپنی بیوی کو حاصل کیا لیکن اس دوران وہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی جو چنگیز خان کے مخالف سردار کا تھا۔ لیکن چنگیز خان نے نہ صرف یہ کہ بیوی کو دوبارہ سے اُس کو وہی مقام دیا اور بچے کو بھی اپنا سمجھ کر پالا پوسا۔ اگر چہ اکثر معاشروں میں ان عورتوں کو نہ تو واپس لیا جاتا تھا اور نہ ہی اُن کی عزت کی جاتی تھی مثلاً ہندوستان میں رامائن کی کہانی میں جب سیتا واپس آتی ہے تو رام کو اُس کی پاکبازی پر شبہ ہوتا ہے۔ اُس پر سیتا دیوتاؤں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اُس کی پاکبازی کو ثابت کریں۔ اس پر زمین شق ہوتی ہے اور سیتا اُس میں سما جاتی ہے۔ اس لئے سیتا ہندوستانی معاشرے میں پاکبازی کی علامت ہے۔ جنگ میں فتح کے بعد خاص طور سے شکست شدہ حکمرانوں کی بیگمات کو فاتحین اپنے لئے حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر سازش کے ذریعے کسی حکمراں کو تخت و تاج سے محروم کیا جاتا تھا تو اس صورت میں بھی اُس کے حرم کی عورتوں کو بطور مالِ غنیمت سمجھ کر رکھ لیا جاتا تھا مثلاً جب ہندوستان میں سیّد برادران جو بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوئے فرخ سیر کو قتل کیا تو اُس کے حرم کی کنیزوں کو بھی اپنے تصرف میں لے لیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی بھی ہندوستان پر اپنے حملوں کے دوران مال و دولت کے ساتھ عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

عورت کا المیہ یہ ہے کہ ایک جانب تو مرد اُس کی محبت اور چاہ میں اسیر رہتا تو دوسری جانب اُس کو برابر کا مقام دینے کو تیار نہیں۔ ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ ال بویہ کا ایک حکمران اپنی ایک کنیز کے ساتھ اس قدر والہانہ محبت کا شکار ہوا کہ اُس کے بغیر اُس کو چین نہیں آتا تھا۔ اس پر اُس کو یہ خیال ہوا کہ یہ کنیز اُس کی کمزوری ہے اور یہ کمزوری اُس کی مردانہ افضلیت کے خلاف ہے لہٰذا اُس نے یہ حکم دیا کہ کنیز کو قتل کر دیا جائے تاکہ اُس کی مردانہ کمزوری کی وجہ ختم ہو جائے۔

جب عورت مرد کی ملکیت بن جاتی تو وہ اُس کی عزت کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ذرا سے شک وشبے کی بناء پر عورتوں کو قتل کر دیا جا تا ہے۔ایک واقعہ میں جو فاطمی حکومت کے دوران پیش آیا۔کہا جاتا ہے کہ ایک دن خلیفہ الحاکم کی سواری جارہی تھی راستے میں ایک پبلک باتھ ہاؤس سے جو عورتوں کے نہانے کے لئے مخصوص تھا وہاں سے اُن کی ہنسی اور قہقہوں کی آواز آئی اس پر خلیفہ عورتوں کی اس بے شرمی پر اس قدر برہم ہوئے کہ فوراً حکم دیا کہ باتھ روم کو دیواریں چن کر عورتوں کو زندہ دفن کر دیا جائے۔

پاکستانی معاشرے میں اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جدید دنیا میں عورتوں کی آزادی اور حقوق کی جو تحریکیں اُٹھیں اُن کا اثر ابھی تک ہمارے معاشرے میں نہیں ہوا کیونکہ جب تک عورت کو اس کی اپنی ذات سے شناخت نہیں کیا جاتا اُس وقت تک مرد کی بالا دستی قائم رہے گی۔کیونکہ ہمارے معاشرے میں عورت کو بچے پیدا کرنے اور گھریلو کام کاج کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔اس لئے مرد کی نظر میں وہ ایک ذہین اور باصلاحیت ساتھی نہیں ہے۔تحریک نسواں کی خواتین جہاں ایک طرف عورتوں میں شعور پیدا کر رہی ہیں وہیں دوسری طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ مردوں میں بھی آگاہی ہو۔تاکہ اُن کی نظروں میں عورت کی کمتری کا نظریہ ختم ہو اور وہ اُس کے حقوق کے لئے مل کر جدوجہد کریں۔

پسماندگی اور جمہوریت

پاکستان میں اس وقت جو انتشار کنفیوژن اور بدنظمی ہے اس کے بارے میں کئی سوالات اُبھرتے ہیں کہ وہ کونسی وجوہات ہیں جنھوں نے ہماری سوسائٹی کو ترقی کی بجائے تنزلی کی جانب موڑ دیا۔ 1947ء سے اب تک ہم نے کئی سیاسی نظاموں کا تجربہ کیا ان میں بنیادی جمہوریت آمرانہ حکومتیں اور جدید جمہوری نظام شامل ہیں۔ ایوب خان کے زمانہ میں پیر علی محمد راشدی نے انہیں بادشاہ بننے کا مشورہ بھی دے دیا تھا۔ اگر ایوب خان اس پیشکش کو قبول کر لیتے تو ہم بادشاہت کے تجربے سے بھی مستفید ہو جاتے۔

لیکن جب ہم پاکستان میں جمہوریت کے نفاذ اور اُس کی ناکامی کے اسباب تلاش کرتے ہیں تو اس میں ہمیں معاشرے کی پسماندگی نظر آتی ہے۔ اگر پسماندگی کے الفاظ پر غور کیا جائے تو ہم کہہ سکتے کہ ایسا معاشرہ کہ جس کے سماجی، معاشی اور سیاسی ادارے اپنی افادیت کھو کر شکست خوردہ اور خستہ ہو کر ختم ہو چکے ہیں، اور اُن میں نئے حالات سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی۔ لہٰذا پسماندگی سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ذہنی طور پر معاشرے کا دیوالیہ پن مثلاً ہماری ذہنی ترقی میں جو ادارے اور روایات شامل ہیں اُن میں جاگیرداری، قبائلی نظام، مذہبی فرقہ پرستی اور سماجی طبقاتی نظام شامل ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ایک پسماندہ معاشرے میں اگر کسی ترقی یافتہ اور جدید نظام کو لا کر نافذ کیا جائے تو پسماندہ معاشرہ ان کو اپنے اندر ضم کر کے انہیں اور بھی زیادہ پسماندہ بنا دیتا ہے۔

یہی صورت حال ٹیکنالوجی کی ہے۔ پاکستان میں تمام جدید ٹیکنالوجی آ گئی ہے کہ جن ملکوں میں اس ٹیکنالوجی کی ایجاد ہوئی اور اُس کو فروغ دیا تو اُس کے ساتھ ہی اُن کی ذہنی ترقی بھی اُس میں شامل تھی۔ ہم نے چونکہ اس ٹیکنالوجی کو ایجاد نہیں کیا بلکہ ترقی یافتہ ملکوں سے حاصل کیا اس وجہ

سے ہم اُس کا وہی استعمال کر رہے ہیں جو ہمارے پسماندہ ادارے اور روایات چاہتے ہیں۔ مثلاً اگر پاکستان میں ٹی وی چینلز کے پروگراموں کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ پروگرام نہ تو ہمارے شعور میں اضافہ کر رہے ہیں، اور نہ ہی ہماری تعلیم کو بہتر بنانے میں ہمارا حصہ ہے۔ اکثر پروگراموں کی نوبت انتہائی واہیات اور بے معنی گفتگو پر مبنی ہوتی ہے۔ خبروں میں بین الاقوامی حالات کے بارے میں نہ تو کچھ بتایا جاتا ہے اور نہ ہی تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خبروں کا ایک بڑا حصہ سیاست دانوں اور کھلاڑیوں کی شادیوں اور ولیموں کے بارے میں ہوتا ہے۔

یہی پالیسی اخباروں کی ہے کہ جن میں کالم نگار بھونڈے اور سطحی مذاق سے لوگوں کو دلچسپی فراہم کرتے ہیں یا جذباتی زبان لکھ کر لوگوں کو مشتعل کرتے ہیں۔ اسی ذہنیت کا اظہار کمپیوٹر کے استعمال میں بھی ہے کہ جس میں فیس بک اور دوسرے ذریعوں سے لوگ اپنی ذات کو اُبھارتے ہیں۔ یا پھر میڈیا کو فرسودہ رسم و رواج کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی ٹیکنالوجی لوگوں کو باشعور بنانے کے بجائے اُن میں جہالت اور فرسودگی کو پیدا کر رہی ہے۔

اُس کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم جمہوریت اور اُس کے اداروں کے بارے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے سیاست دان اور حکمران طبقے جمہوری نظام کو عوام کی فلاح اور بہبود کے بجائے اپنے اقتدار اور مراعات کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً کبھی کہا جاتا ہے کہ ملک میں پارلیمانی طرز کی جمہوریت ہونی چاہیئے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ملک کے لئے صدارتی نظام حکومت سب سے اچھا ہے۔

پاکستان نے ان دونوں کا تجربہ کیا اور اُس کو ناکامی سے واسطہ پڑا۔ پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی وجہ اُس کی سماجی پسماندگی ہے۔ کیونکہ یورپ میں جب جمہوری اداروں کا ارتقا ہوا تو وہاں سے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوا جس نے امراء کی بالادستی کو ختم کیا۔ عوام میں تعلیم کا فروغ ہوا جس کی وجہ سے اُن میں سیاسی شعور آیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں کسی ایک نظریے پر قائم رہی جیسے قدامت پسند یا لبرل پارٹی تو اپنے نظریات کے تحت سیاسی نظام کو مستحکم کرنا چاہتی تھیں۔ انتخاب میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو اپنے اپنے منشور کے ذریعے قائل کرنا چاہتی تھیں۔ مذہب کے معاملے میں سیاست کو غیر جانب دار بنایا گیا۔ جمہوری اداروں اور روایات پہ ارتقا

یورپ کے ملکوں میں کئی صدیاں گزرنے کے بعد پختہ ہوا۔

پاکستان میں ہم نے یہ ترقی یافتہ اور پختہ جمہوری ادارے ایک ایسے معاشرے میں رائج کرنے کی کوشش کی کہ جہاں جاگیردارانہ نظام معہ اپنی روایات کے قائم ہے۔ سجادہ نشینوں اور پیروں کے خاندان کا روحانی اثر ہے۔ عوام کی اکثریت اَن پڑھ اور جاہل ہے۔ قبائل اور برادریوں کے تعصّبات موجود ہیں۔ فرقہ پرستی اور مذہبی جذبات سیاست کا حصہ بن چکے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کا نہ تو اپنا کوئی نظریہ ہے اور نہ ہی کوئی پروگرام کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد اختیارات کو کیسے استعمال کریں گے۔

لہٰذا سیاسی جماعتیں ایسے امیدوار منتخب کرتی ہیں کہ جن کا تعلق کسی جاگیردار خاندان سے، قبیلے یا برادری سے ہو اور جو اس بنیاد پر ووٹ حاصل کر سکیں۔ جب کوئی بھی سیاسی پارٹی اقتدار میں آتی ہے تو اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی مراعات کو کیسے محفوظ کیا جائے مثلاً زرعی اصلاحات کی مخالفت کی جاتی ہے۔ زرعی ٹیکس کا نفاذ ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ اشرافیہ اور حکمران طبقوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جاتی ہیں۔ اقتدار میں آنے والی ان پارٹیوں کو عوام کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور یہ اپنے اقتدار کو جمہوریت کے نام پر مستحکم کرتی ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اس ملک میں حقیقی جمہوریت کو قائم کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ملک پسماندگی سے نہیں نکلے گا یہ جاگیردارانہ، قبائلی اور برادری کا نظام ختم نہیں ہو گا جمہوری ادارے بھی پسماندہ ہوتے چلے جائیں گے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ جب تک لوگوں کی ذہنی ترقی نہ ہو گی تعلیم کے ذریعے ان میں نئے خیالات اور افکار کو پیدا نہیں کیا جائے گا اُس وقت تک ہمارا معاشرہ، اُس کا سیاسی نظام اور اُس میں موجود ٹیکنالوجی ہمیں اور پسماندہ کرتی رہے گی۔